فہرست مضامین

تاریخ ہند جلد دوم

(طبع دوم)

باب ۱

باب ۲

سلطنتِ دہلی کا پہلا عروج

*

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تاریخ ہند جلد دوم

باب ۱

سلطنت دہلی کی بنا و استحکام

پہلی فصل شمالی ہندوستان کی شیرازہ بندی

شمالی ہندوستان کی جس فتح کا ذکر جلد اول میں ہماری نظر سے گزرا وہ دنیا کی سیاسی اور جنگی تاریخ میں ایک عظیم الشان واقعہ ہے۔ بھٹنڈے سے لکھنوتی قریب ایک ہزار میل کے فاصلے پر تھی۔ اس علاقے کا عرض بھی جسے سلطان معز الدین غوری یا اس کے ماتحتوں نے فتح کیا چار سو تا پانسو میل سے کم نہیں۔ بہ الفاظ دیگر صرف بارہ تیرہ برس میں مسلمان حملہ آوروں کا تخمیناً ساڑھے چار لاکھ مربع میل کے ایسے رقبے پر قبضہ ہو گیا جس میں برِ اعظم ایشیا کے نہایت سرسبز و زرخیز خطے شامل تھے۔ کوئی تحریری ماخذ ایسا نہیں جس کی

بنا پر ہم اس علاقے کی آبادی کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر سکیں، لیکن جہاں کی ریاستوں میں کئی کئی لاکھ جنگجو سپاہی موجود ہوں وہاں کی کل مردم شماری یقیناً کئی کروڑ ہوگی۔ اس کے مقابلے میں، حملہ آوروں کی مجموعی تعداد غالباً ڈیڑھ لاکھ بھی نہ تھی کیونکہ قطب الدین ایبک کے انتقال تک، جن لڑائیوں کا حال ہم پڑھتے ہیں، ان میں تعداد سپاہ کے اعتبار سے سب سے بڑی وہی ترائن کی دوسری لڑائی ہے جس میں خود سلطان معز الدین غوری نے ایک لاکھ بیس ہزار سوار کی جمعیت سے جنگ کی تھی۔[1]

اسلامی فتح کے وقت ہند کی سیاسی حالت

فتح کے وجوہ بیان کرنے میں بالعموم سب تاریخ نویس متفق ہیں کہ اہل ہند کے چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں متفرق ہونے اور باہمی نفاق نے انھیں تباہ کیا۔ دوسرے یہ کہ نہ صرف جانبازی اور دلیری میں بلکہ جسمانی قوت، اور استقلال اور جفاکشی کے اعتبار سے بھی مسلمان حملہ آور ہندوؤں پر فوقیت رکھتے تھے۔ ان کا فوجی نظم اپنے ہندو حریفوں کی نسبت کہیں بہتر تھا اور اس میں کچھ بھی شبہ نہیں کہ اُنھوں نے کھلے میدانوں میں لڑ کر اپنی سپاہیانہ برتری ثابت کر دی تھی۔ اہل ہند پر غلبہ پانے کی ایک اور وجہ اُس مذہبی جوش اور باہمی اتحاد کو قرار دے سکتے ہیں جو اہل ہند کے مقابلے میں اُس زمانے کے مسلمان سپاہیوں میں پایا جاتا تھا۔ لیکن فتح کی اِن عام وجوہ کی تہ میں ہمیں اہل ہند کی اندرونی حالت اور اس بدامنی کا سُراغ ملتا ہے جو مذکورہ بالا سیاسی انتشار کا لازمی نتیجہ تھی۔ کیونکہ چند مشہور اور بڑی ریاستوں کے علاوہ، جن کا اس تاریخ کی جلد اول میں ذکر آ چکا ہے مسلمانوں کی آمد کے وقت بیشمار چھوٹی چھوٹی ریاستیں ایسی موجود تھیں جو برائے نام کسی بڑے راجہ کے ماتحت ورنہ اندرونی طور پر قریب قریب خود مختار اور موروثی حکومتیں بن گئی تھیں۔ مثال کے طور پر اگر کرنل ٹاڈ کی روایت صحیح ہے تو، صرف ریاست دہلی میں، جس کا رقبہ اِس زمانے کی دو قسمتوں یا کمشنریوں سے زیادہ نہ ہوگا، ایک سو اٹھارہ ایسی جاگیریں اور ریاستیں موجود تھیں جن کے اکثر رئیس یا ٹھاکر موروثی حکمراں تھے۔[1] پھر یہ کہ پرتھی راج یا جے چند جیسے کسی راجہ کی بھی بڑی کامیابی یہی تھی کہ اپنے ان برائے نام باج گزاروں سے جنگ کے وقت فوجی امداد حاصل کرے کسی دربار یا شادی بیاہ

---

[1] اینلز۔ جلد دوم صفحہ ۷۔

باب

کے موقع پر وہ جمع ہوکر اُسے نذریں دکھا دیتے ہوں گے جو گویا باج گزار ہونے کا اقرار تھا۔ بہت ممکن ہے کہ خراج یا مالگزاری کے طریق پر اُنھیں سالانہ بھی کوئی مقررہ رقم راجہ کو ادا کرنی پڑتی ہو۔ لیکن ان پابندیوں کے علاوہ اپنی اپنی جگہ پر وہ خود مختار ہوتے تھے کہ رعایا کے ساتھ جو چاہیں سلوک کریں۔ برابر والے ہمسایوں کے ساتھ اُن کی آئے دن لڑائی ٹھنی رہتی ہوگی کیونکہ ذرا ذرا سی بات پر لڑنے مرنے کو آمادہ ہو جانا راجپوت سرداروں کے قومی خصائص میں داخل تھا۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی خانہ جنگیوں میں، ملکی یا سیاسی ترقی کرنا درکنار، غریب رعایا آرام و اطمینان کے ساتھ زندگی بھی نہیں بسر کرسکتی تھی۔ لوگوں کے اخلاق پر اس بدامنی کے جو اثر پڑتے ہیں ان پر مفصل بحث کرنے کا یہ موقع نہیں لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسی سیاسی انتشار اور بدنظمی کی وجہ سے شمالی ہند میں رہزنی بہت سے گروہوں کا پیشہ بن گئی تھی اور اُس نے نہ صرف تجارت بلکہ معمولی سفر و سیاحت کو بھی نہایت مخدوش بنا دیا تھا۔ خود ہندوستان کے اندرونی علاقوں میں آمد و رفت میل جول اور مبادلۂ خیالات کے ذرایع قریب قریب مسدود ہوگئے تھے ۔

غرض، جیسا کہ قدیم تاریخ ہند کے مشہور محقق ونسنٹ اسمتھ نے جتایا ہے[1]، گو ہونوں کی شکست کے بعد تقریباً پانچ صدی تک اہل ہند بیرونی حملوں سے محفوظ رہے لیکن اس طویل مدت میں نہ تو وہ کوئی مفید جمہوری قسم کا سیاسی نظام قایم کرسکتے تھے اور نہ اُن میں کوئی ایسا اولوالعزم بادشاہ پیدا ہوا تھا جو اشوک یا چندرگپت (موریا) کی مثل تمام شمالی ہند کو ایک مرکزی حکومت کے ماتحت متحد کرتا اور لوگوں کو اندرونی بدامنی اور بیرونی حملوں سے بچا لیتا؛ بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس قدر زمانہ گزرتا گیا ہندوستان کی سیاسی حالت بدتر ہوتی گئی۔ اور کہنا چاہئے کہ جب یہ امید بھی باقی نہ رہی کہ خود ہندوستان اپنی اصلاح کرسکتا ہے تو قضا و قدر نے بیرونی ہند سے ان مسلمان فاتحین کو بلایا جو ہندی حکمرانوں سے زیادہ عالی حوصلہ تھے اور اس خدمت کو انجام دینے کی نہ زیادہ اہلیت یا کم سے کم زیادہ آرزو رکھتے تھے ۔

قطب الدین کی تمام فتوحات جو پچھلی جلد میں بیان کی گئی ہیں اس قدر عظیم الشان تھیں

[1] ارلی ہسٹری، ۳۵۷۔

کہ اسلامی ملکوں میں ان کے چرچے ہونے لگے تھے۔ لیکن ان کے باوجود قطب الدین ابھی تک اپنے آقا کا غلام تھا۔ اگرچہ نیک دل سلطان اس پر نہایت شفقت کرتا اور اسے اپنا "پسر خواندہ" بنا چکا تھا، لیکن اسے غلامی سے باضابطہ آزادی اپنے آقا کی وفات کے بعد اس وقت ملی جبکہ سلطان کے شرعی وارث اور غور کے فرماں روا محمود غوری نے اسے چتر و امارت بادشاہی و خطاب سلطانی و خط آزادی" دیگر ہندوستان بھیجا اور "ملک" قطب الدین کے بجائے وہ سلطان ایبک کے لقب سے لاہور میں تخت نشین ہوا طبقات ناصری میں اس تخت نشینی کی تاریخ ۱۸ ذیقعدہ ۶۰۲ھ درج ہے، لیکن بعض تاریخوں میں اسے چند ماہ بعد ربیع الاول ۶۰۳ھ کا واقعہ لکھا ہے۔

قطب الدین ایبک کی ۱۲۰۶ء میں لاہور میں تخت نشینی ہندوستان کی قومی تاریخ میں ایک نئے اور ولولہ انگیز دور کا آغاز ہے اور اسی سنہ سے ہم ہندوستان کی وسطی تاریخ شروع کرتے ہیں۔ کیونکہ شہاب الدین غوری کے انتقال سے ہندوستان کی جدید حکومت میں غیر معمولی تغیر پیدا ہوگیا یعنی اس وقت تک ہندوستان کے جدید حکمران جو باہر سے آکر ہندوستان پر مسلط ہوئے تھے باہر سے حکومت کرتے تھے یعنی غزنی یا غور ان کا پائے تخت تھا اور ہندوستان کی ایک صوبے کی حیثیت تھی۔ لیکن جب شہاب الدین غوری کے انتقال کے بعد قطب الدین ایبک مرحوم سلطان کا ہندوستان میں جانشین قرار دیا گیا تو اس کو غزنی یا غور سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ دہلی اسکا پائے تخت قرار پایا اور اسی دہلی میں بیٹھ کر یہ ہندوستان کے تمام مقبوضات پر حکومت کرنے لگا۔ دوسرے الفاظ میں ہندوستان کا پائے تخت جو ملک کے باہر غزنی یا غور میں تھا وہ خود ہندوستان میں آگیا کیونکہ قطب الدین اور اس کے تمام جانشینوں نے ہندوستان کو اپنا گھر بنا لیا تھا اور وسط ایشیا سے اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا تھا۔ اس طریقے سے ۱۲۰۶ء سے قومی حکومت کا آغاز ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ یقینی طور پر معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ قطب الدین چند سال اور زندہ رہتا تو اس کا آئندہ اصول عمل کیا ہوتا ممکن ہے کہ غزنی کی بادشاہی اور مرحوم آقا کی پوری سلطنت پر قبضہ کرنے کی آرزو اس کو بیرون ہند کی جانب کھینچتی اور اپنے ہم چشم اور ہم نشیں امرائے ترک میں امتیاز حاصل کرنے کا لالچ دلاتی ہوگی لیکن اگر اس کے تربیت یافتہ غلام اور لائق جانشین کی آئندہ حکمت عملی دیکھ کر قطب الدین کے دلی منصوبوں کا اندازہ کرنا جائز ہے تو صاف نظر آتا ہے

باب

کہ نہ صرف وہ بلکہ اس کے ساتھ بہت سے ترک سردار غالباً یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ ان کا "مستقبل" ہندوستان میں ہے۔

قطب الدین کا منصوبہ

دوسری چیز یہ ہے کہ قطب الدین ایبک کی تخت نشینی ہندوستان کی متحدہ سلطنت کا پیش خیمہ ثابت ہوئی تخت نشین ہوتے ہی قطب الدین نے تمام مخالف طاقتوں کو راستے سے ہٹا کر شمالی ہند کو ایک رشتے میں منسلک کرنے کی کوشش کی تاکہ تمام ملک دہلی کے مرکز کے تحت آ جائے۔ اور یہ قطب الدین کا ایک مبارک منصوبہ تھا کیونکہ ملک کو اس بات کی بہت ضرورت تھی کہ طوائف الملوکی کی جگہ جس میں ہندوستان کا ملک برسوں سے مبتلا تھا متحدہ سلطنت پیدا کی جائے اور حقیقت میں یہ بات کچھ کم سبق آموز نہیں ہے کہ ایک افغانی یا غوری بادشاہ کے غلام کے دل میں وہ وسیع سلطنت ہند قائم کرنے کے ولولے پیدا ہوئے جن سے دہلی کے عالی نسب چوہانوں اور قنوج کے ذی ثروت گھرانوں کے دل و دماغ عاری تھے۔ تاریخ ہند میں راجہ ہرش کے بعد قطب الدین ایبک ہی وہ شخص ہے کہ جس کا تمام ہندوستان کو "ایک چتر کے نیچے" لانے کی آرزو کرنا بجا تھا صدیوں کے بعد لکھنوتی سے نہروالہ تک تمام اہل ہند اسی کے زمانے میں ایک سلطنت کے باشندے کہلائے اور جیسا کہ ہم سابق میں اشارہ کر چکے ہیں بچھڑے ہوئے پنجاب کو اسی تدبیر اور شمشیر نے غزنی سے علیحدہ کر کے دوبارہ ہندوستان کے ساتھ ملا لیا۔

قطب الدین کا منصوبہ تو بہت اچھا تھا لیکن اس کو بروئے عمل لانا آسان نہ تھا۔ بات یہ ہے کہ شہاب الدین غوری اور خود قطب الدین کی پے در پے فوج کشیوں سے شمالی ہند کی تقریباً تمام ہندو طاقتوں کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ تخت نشیں ہونے کے بعد قطب الدین کو پھر کسی راجپوت طاقت کو زیر کرنا نہیں پڑا اگر شہاب الدین کے انتقال سے چند نئی طاقتیں پیدا ہو گئیں جن کا مقابلہ ایبک کے لئے بہت مشکل تھا اور یہ مسلمان طاقتیں تھیں یعنی یہ بنگال کے فاتح خلجی اور ایبک کے ہمسر غلام تھے جو سندھ اور غزنی پر قابض تھے۔ جس طرح ایبک اپنے آقا کی طرف سے سلطنت دہلی پر متعین تھا اسی طرح قباچہ سندھ پر اور یلدوز غزنی پر متعین تھا۔ اگرچہ ایبک کو غالباً اس غرض سے سلطنت دہلی کا والی بنایا گیا تھا کہ بنگال سے لیکر سندھ تک تمام ملک اس کے زیر نگیں رہے لیکن یلدوز اور قباچہ اس کے محکوم ہونے والے نہ تھے کیونکہ یہ بھی اپنے آقا کے اسی طرح کے غلام تھے جس طرح خود ایبک تھا اور اس طرح یہ لوگ بھی اپنے کو ایبک کا ہمسر سمجھتے تھے۔ بنگالے کی مزاحمت تو کچھ قدرتی حالات کے تحت رفع ہو گئی

اتفاق یہ ہوا کہ بختیار خلجی جو بنگالے کا فاتح تھا ۱۲۰۶ئہ میں مرگیا یا خلجی قبیلے کے سربرآوردہ رکن علی مردان خاں کے ہاتھ سے مار دیا گیا۔ لیکن علی مردان خاں کو اس فعل شنیع سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ایک خلجی عہدہ دار محمد بن شیریں نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی اور علی مردان کو گرفتار کرلیا۔ مگر علی مردان خاں قید سے بھاگ کر قطب الدین کے پاس لاہور آیا اور اس کی عدم موجودگی میں محمد بن شیریں کے مخالفوں نے اس کا بھی خاتمہ کر دیا تو علی مردان خاں نے قطب الدین کی مدد سے بنگالے کی صوبہ داری حاصل کرلی اور قطب الدین کی زندگی تک سلطنت دہلی کے ماتحت رہا۔

چونکہ مغربی رقیبوں کو تلوار کے زور سے زیر کرنا مشکل تھا اس لئے ایبک نے ان کو اپنے زیر اثر لانے کے مختلف طریقے استعمال کئے۔ اگرچہ اسلامی مورخ اس بات کو واضح نہیں کرتے کہ قطب الدین فن سیاست کا مشاق شاطر تھا۔ کہرام کی معمولی صوبہ داری سے اس کا اس قدر جلد بڑھ کر تمام ہندوستان کا اعلیٰ صوبہ دار ہو جانا محض سلطان معز الدین کی عنایت خاص کی دلیل نہیں بلکہ درحقیقت اس ترقی میں قطب الدین کے سپاہیانہ اوصاف کے ساتھ سیاسی قابلیت کا دخل تھا اور جیسا کہ ہم تحویل گوالیار کے معاملے میں دیکھ چکے ہیں وہ اپنے ہاتھ پیر مضبوط کرنے میں شاید اپنے ہمچشموں کے خلاف چالاکی کرنے سے بھی نہ چوکتا تھا۔ ہندوستان کے دوسرے صوبہ داروں سے اس کا سلوک نہایت لطف آمیز رہا۔ لیکن اس نرمی اور آشتی کے باوجود اس نے ان کے دل میں اپنی بالادستی اور ان کی ماتحتی کا خیال اس طرح جما دیا تھا کہ اس کی تخت نشینی پر لکھنوتی سے نہروالہ تک کوئی مخالف آواز بلند نہیں ہوئی۔

مغربی رقیبوں کے مقابلے میں اس نے پہلا ہتھکنڈا یہ استعمال کیا تھا کہ اس نے اپنی رسم تخت نشینی بجائے دہلی کے لاہور میں منائی تھی۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ پنجاب کا یہ حصہ سلطان محمود کے زمانے سے غزنی کے ساتھ ملحق تھا اور اسی کا ایک صوبہ شمار ہوتا تھا۔ اس لئے تاج الدین یلدوز کو غزنی کی وراثت کے ساتھ لاہور کا دعویٰ ہوا تو یہ بالکل قدرتی بات تھی۔ قطب الدین نے اس پرانی روایت کو توڑنے کے لئے لاہور میں اپنی تخت نشینی کی۔ اس کے یہ معنی تھے کہ اس علاقے کو وہ اپنی سلطنت کا جزو لاینفک سمجھتا ہے۔ دوسرے ان لوگوں سے اس نے ازدواجی تعلقات پیدا کئے۔ ناصر الدین قباچہ کو اپنی بیٹی دے دی

اور تاج الدین یلدوز کی بہن سے خود شادی کر لی اور غالباً ان حالات میں جہاں تلوار کام نہ دے شادی بیاہ کا حربہ بھی استعمال کیا جاتا ہے اور اس کی مثالیں تاریخ ہند کے اور زمانوں میں بھی ملتی ہیں۔ یہ حربہ اس حد تک تو کامیاب ہوا کہ قباچہ نے اپنے خسر کی اطاعت اختیار کر لی لیکن یلدوز ایسا حریف تھا کہ باوجود ازدواجی تعلق کے باوجود اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا تھا۔ چنانچہ یہ کہا جاتا ہے کہ اس حریف سے قطب الدین آخر تک ڈرتا تھا۔ یلدوز قباچہ کی اطاعت سے مشتعل ہوگیا اور اپنے دعوے کے اثبات میں سندھ پر حملہ کر دیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قباچہ کو ملتان چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ ایبک کے لئے مدافعت ضروری تھی ورنہ اس کے منصوبے کی تکمیل نہیں ہو سکتی تھی۔ ایبک کے حملے سے یلدوز کو شکست ہوگئی اور وہ کرمان بھاگ گیا۔ اسی کامیابی کے گھمنڈ میں ایبک ۱۲۰۸ئ میں غزنی میں بہ حیثیت فاتح کے داخل ہوگیا لیکن اس کامیابی کے بعد غلطی بھی کی یعنے عیش وعشرت کے ساتھ فتح کی خوشیاں منانے لگا۔ اور اس کی فوج تاخت وتاراج کرنے لگی۔ بعض اہل غزنی نے یلدوز کو اس کی اطلاع کر دی اور وہ اس سے فائدہ اٹھا کر اچانک غزنی پر حملہ آور ہوگیا۔ اس اچانک حملے سے ایبک پر اسقدر دہشت سوار ہوئی کہ وہ ۱۲۰۹ئ میں بغیر لڑے بھڑے لاہور بھاگ آیا اور جیسا کہ ایک تاریخ میں صراحتاً مرقوم ہے وہ اپنی وفات تک یلدوز کی فوج کشی کے خوف سے لاہور میں مقیم رہا۔ ۱۲۱۰ئ میں چوگان کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر فوت ہوا۔

قطب الدین ایبک کے اوصاف ذاتی میں ایک وصف ایسا ہے جس کا ہر مورخ نے خاص طور پر ذکر کیا ہے اور یہ اس کی سخاوت تھی جس کی بدولت "لکھ بخش" خطاب پایا تھا اور فرشتہ لکھتا ہے کہ آج تک کسی سخاوت کی بہت زیادہ تعریف کرنی منظور ہو تو اہل ہند اسے "قطب الدین کل" یعنے اپنے زمانے کا قطب الدین کہتے ہیں اور سچ پوچھئے تو اس سے بڑھ کر شہرت کسی کو کیا حاصل ہوگی کہ چار سو برس تک اس کا نام سخاوت میں ضرب المثل رہے۔ مگر قابل لحاظ بات یہ ہے کہ ہندوستان کے سب سے پہلے اسلامی فرماں روا کی یہ سخاوت اپنے ہم قوموں سے مخصوص نہ تھی بلکہ اس سے ہندو رعایا بھی اسی طرح مستفیض ہوتی تھی جس طرح اس کے ہمراہی مسلمان کو

وفات اور جانشین۔

قطب الدین کی جانشینی کا مسئلہ جس طرح طے ہوا اس سے بھی مذکورۂ بالا قول کی تائید ہوتی ہے۔ جلد اول میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ تسخیر دہلی کے بعد اسی شہر کو

نائب سلطان کی حیثیت سے قطب الدین ایبک نے اپنا مستقر قرار دیا تھا (۵۹۹ھ/۱۱۹۲ء)
لیکن ظاہر اُس کی یہ نیابت صرف "ہندوستان خاص" کے لئے تھی اور پنجاب تک
تاج الدین یلدوز کی میراث میں داخل تھا۔ لیکن جب کھوکھروں نے بغاوت کی (۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء)
اور سلطان معزالدین کی امداد کے لئے قطب الدین دہلی سے بہت بڑی فوج لے کر گیا
اور زیادہ تر اسی کی مدد سے یہ خوفناک فساد فرو ہوا، تو معلوم ہوتا ہے کہ اُسی وقت سے
قطب الدین پنجاب کا دعویدار اور اس ملک کو سلطنت ہند میں شامل کرنے کا آرزومند
ہوگیا تھا۔ یہی سبب ہوا کہ سلطان معزالدین کی وفات کا حال سنتے ہی اس نے بڑھ کر لاہور پر
قبضہ کرلیا اور جیسا کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں، اُس کی "بادشاہی" کا زیادہ تر زمانہ اپنے
مغربی رقیبوں کی لڑائیوں میں یا حملے کے اندیشے کی بدولت اسی شہر میں بسر ہوا۔ مگر اس کے
یہ معنی نہ تھے کہ وہ شمالی ہندوستان کے جدید اور قدرتی پائے تخت دہلی کی بجائے
شہر لاہور کو اپنا دارالملک بنانا چاہتا ہے جو ابھی تک صوبۂ غزنی کا ایک شہر سمجھا جاتا تھا
اور اسے وہی بادشاہ اپنا پائے تخت بنا سکتے تھے جنھیں شمالی ہند کی وسعت کا علم نہ ہو
اور یا دوآب و بنگال کے شاداب صوبے چھوڑ کے وہ صرف پنجاب و سندھ کی حکومت
پر قناعت کریں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قطب الدین کی وفات کے بعد جب بعض فوجی
سرداروں نے اُس کے (لے پالک؟) بیٹے[1] آرام شاہ کی بادشاہی کا لاہور میں اعلان کیا
تو ہندوستان خاص کے صوبہ داروں نے اس کی حکومت تسلیم نہ کی۔ سلطنت کے اکثر
بڑے بڑے عہدہ دار دہلی میں تھے اُنھوں نے مل کر سپہ سالار علی اسمٰعیل کی تحریک سے
شمس الدین ایل تتمش یا التمش[2] کو بادشاہ منتخب کیا جو اُن دنوں اقطاع بداؤن کا حاکم

---

[1] طبقات ناصری کی عبارات سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاید قطب الدین کے صرف تین لڑکیاں تھیں اور بعض اور
مورخ بھی لکھتے ہیں کہ اُس کے کوئی بیٹا نہ تھا۔ اس صورت میں آرام شاہ جسے سکوں میں اور اکثر تاریخوں میں
"ابن قطب الدین" لکھا ہے، غالباً اس کا متبنیٰ ہوگا۔ راورٹی کی تحقیقات بھی یہی ہے۔ دیکھو اس کا
ترجمہ صفحہ ۵۲۹۔

[2] اس ترکی نام یا عرف کے متعلق بہت اختلاف ہے۔ غالباً صرف مُلّا عبدالقادر بدایونی نے اپنی تاریخ میں
اس کے معنی لکھے ہیں کہ چاندگہن یا اس رات جو بچہ پیدا ہو اُسے ترک اس نام سے پکارتے ہیں۔ (منتخب التواریخ ۶۲)

باب

اور قطب الدین کا عزیز غلام تھا؛ بنگالے کے خلجی امرا نے بھی آرام شاہ کی بادشاہی نہ مانی اور علی مردان خلجی نے سلطان علاء الدین کے لقب سے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ سندھ جسے آج کل ہم اپنے ملک کا چھوٹا سا حصہ جانتے ہیں، اُن دنوں رقبے میں قریب قریب پنجاب کے برابر اور پہلے ہی "ہندوستان" سے علٰحدہ ملک سمجھا جاتا تھا۔ اول ہندوؤں کی اور پھر عرب فاتحین اور مسلمانوں کی جو ریاستیں یہاں قائم ہوئیں اُن کا ہندوستان خاص کے ساتھ مدتوں سے کوئی سیاسی تعلق نہ رہا تھا اور قطب الدین ایبک نے بھی اپنے ہمعصر ناصر الدین (قباچہ) کے ساتھ جو لڑائیاں لڑیں وہ سندھ کو لینے کے لئے نہ تھیں بلکہ پنجاب کو بچانے کے واسطے تھیں کیونکہ یلدز کی طرح قباچہ اس صوبے کو اپنی "سلطنت سندھ" کا جزو بنانا چاہتا تھا؛

سلطان شمس الدین ۶۰۷ھ تا ۶۳۳ھ ۱۲۱۰ء تا ۱۲۳۵ء

غرض قطب الدین کا منصوبۂ شہنشاہی بگڑ جانے کے آثار نظر آرہے تھے کہ "ملک" شمس الدین پائے تخت دہلی میں داخل ہوا اور چند ہی سال کی مدت میں ثابت ہو گیا کہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ اس قول کو پیش نظر رکھ کے ایک ترکی داں انگریز لکھتے ہیں کہ ترکی میں "آئی" بمعنی چاند اور "توت مش" "یا تتمش" بمعنی گہن درست ہے لیکن اس میں "ل" کا کچھ دخل نہیں ہو سکتا۔ صاحب موصوف کے نزدیک اگر وجہ تسمیہ واقعی وہی ہے جو مُلّا عبد القادرؒ نے لکھی ہے تو اصلی لفظ "آئی تتمش" ہو سکتا ہے جس کا "لام" اصلی جگہ سے ہٹ کر "آئی" کے بعد آگیا اور کثرت استعمال سے یہ نام "اِل تتمش" ہو گیا (کرانیکل آف دی پٹھان کنگز۔ صفحہ ۴۴) جرمن مستشرقوں کی تازہ تحقیقات سے بھی یہ بات ثابت ہو گئی کہ صحیح لفظ اِیل تتمش" ہے (ملاحظہ ہو اِنگوریکا، جلد دوم صفحہ ۵۰ وغیرہ) لیکن راورٹی کے نزدیک یہ لفظ "اِیل تمش" ہے جو اور ترکی ناموں سے مشابہ ہے اگرچہ اس کے ٹھیک ٹھیک معنی معلوم نہیں (راورٹی۔ ۷۰۵) فارسی کتابوں میں عام طور پر اس لفظ کو ملا کر بغیر اعراب کے "التمش" لکھتے ہیں۔ راقم الحروف نے اس لفظ کو صرف دو جگہ شعر میں پڑھا اور دونوں جگہ وہ "آرایش" کے وزن پر ہے پس میرے نزدیک اگر بقول راورٹی اس لفظ کا دوسرا حرف "ی" ہے تو وہ متحرک نہیں بلکہ الف کے ساتھ مل کر ان دونوں کی آواز ہمزۂ مکسور کی سی رہ گئی ہے۔ اور جائز ہو گا کہ ہم اسے "اِیل تتمش" لکھیں اور "اِل تتمش" پڑھیں۔ اور اگر غلط العام کی پیروی کی جائے تو بھی "ت" اور "م" دونوں کو مکسور "اِل تمش" پڑھنا چاہئے؛

باب

ہندوستان کے اہل الرائے اس سے بہتر فرماں روا کا انتخاب نہ کر سکتے تھے۔

روایت عام کی بموجب، یہ نامور بادشاہ جس نے مہاراجہ اشوک (یعنی تقریباً پندرہ صدی) کے بعد، ہندوستان میں سب سے وسیع رقبے پر بادشاہی کی[1]، ایک ترک امیرزادہ تھا جسے، برادرانِ یوسف علیہ السلام کی طرح حاسد بھائیوں نے والدین سے جدا کر کے بیچ دیا اور وہ بخارا کے کسی قاضی کے ہاں پل کر جوان ہوا۔ حسن سیرت اور فراست کے ساتھ خدا نے اسے زیور جمال سے بھی آراستہ کیا تھا اور جب دوبارہ کوئی سوداگر خرید کر اسے غزنی لایا تو اُس کی شہرت سلطان معز الدین سام کے دربار تک پہنچی۔ مگر سوداگر نے اس کی قیمت اتنی زیادہ طلب کی کہ بادشاہ ناراض ہو گیا اور اُس نے دوسروں کو بھی اس غلام کے خریدنے سے روک دیا۔ آخر سال بھر بعد جب قطب الدین ایبک دہلی سے غزنی گیا تو اُس نے بادشاہ سے بطور خاص شمس الدین کے خریدنے کی اجازت لی اور یہ سودا غزنی کی بجائے دہلی میں طے ہوا۔ گویا خود ہندوستان والوں نے اپنے آئندہ فرمانروا کو ایک لاکھ جیتل[2] میں خرید لیا۔

اُس کی آئندہ خدمات اور درجہ بدرجہ ترقی کے تفصیلی حالات لکھنا، سوانح نگار کا کام ہے۔ یہاں اس قدر کافی ہوگا کہ ابتدا سے قطب الدین کی اس پر عنایت خاص تھی وہ شمس الدین کو اپنا بیٹا کہتا اور بڑے سے بڑے عہدے کا اس کو اہل سمجھتا تھا چنانچہ چند ہی سال میں یہ نوجوان غلام اقطاع بداون کا حاکم بنا دیا گیا جو اُن دنوں سلطنت دہلی کا سب سے باوقعت صوبہ سمجھا جاتا تھا۔

مغربی قبضوں پر غلبہ

لیکن، فن ملک داری سے کافی آگہی ہونے کے باوجود ممالک ہند کی مطلق العنان بادشاہی حاصل کرنی کچھ آسان بات نہ تھی۔ خود پائے تخت میں بعض اُمرا اس کے انتخاب سے اختلاف رکھتے تھے اور اس اختلاف کو ظاہر کرنے کا موقع اس لئے موجود تھا کہ لاہور میں ایک اور

[1] عہد شمس الدین کے تاریخی نقشے کا "مور یا" اور "گپت" سلطنتوں کے قیاسی نقشے سے مقابلہ کرنا ہو تو دیکھو ہسٹوریکل اٹلس آف انڈیا۔ نقشہ نمبر ۵، ۷، و ۱۱۔ نیز ارلی ہسٹری نقشہ مقابل صفحہ ۱۶۲ و ۲۸۴۔

[2] یعنی تانبے کا سکہ جو اُن دنوں "جیتل" کے نام سے ہندوستان میں رائج تھا۔

دعویدار سلطنت، التمشؔ کو بزور شمشیر مغلوب کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا پس یہ مخالف سردار دہلی سے نکل کے آرام شاہ کے ساتھیوں میں جا ملے ؛

معلوم ہوتا ہے اب شمس الدین اور اُس کا لاہوری حریف دونوں اس نکتے کو سمجھ گئے تھے کہ پائے تخت دہلی پر قابض رہنا ہی شمس الدین کی اصلی قوت ہے یہی وجہ ہے کہ تخت نشین ہو کر وہ خود شہر سے باہر نہ نکلا اور وہیں اپنی جنگی تیاریاں اور حریف کے ادھر بڑھنے کا انتظار کرتا رہا۔ غالباً اِسی زمانے میں اُس نے سلطان قطب الدین کی بیٹی سے اپنی شادی کی[1] جس کی سیاسی مصلحت ظاہر ہے کہ وہ سلطان مرحوم کا داماد بن کر اپنی جانشینی کے دعاوی کو تقویت پہنچانی چاہتا تھا۔ مگر سچ یہ ہے کہ ایسے مقابلوں میں اصلی جیت ذاتی قابلیت پر منحصر ہوتی ہے اور اِس میزان میں شمس الدین کا رقیب سلطنت بہت ہلکا تھا۔ فوج کشی کے وقت جو اُمرا اِس کے ہمراہ لاہور سے دہلی تک آئے تھے وہ بھی کچھ جم کر نہ لڑے اور شہر کے قریب ہی شکست کھا کر بہت جلد منتشر ہو گئے۔ خود آرام شاہ اور اِس کے خاص خاص رفیق لڑائی میں، یا گرفتار ہو کر بعد میں مارے گئے (۶۰۷ھ ۱۲۱۰-۱۱ء) اور آہستہ آہستہ بنارس، اودھ، بداوں، شمالی وسطی راجپوتانہ اور جنوبی پنجاب کے تمام سرداروں نے سلطان شمس الدین کے آگے گردن جھکا دی ؛

بنگالے کے سرکش خلجیوں کو زیر کرنے کے لئے زیادہ فرصت واہتمام کی ضرورت تھی۔ لیکن اس طرف متوجہ ہونے سے پہلے سلطان کو سلطنت دہلی کے قدیم تر دشمنوں سے لڑنا پڑا۔ اِن میں غزنی کے فرماں روا تاج الدین یلدوز کے ساتھ وہ عہد نامہ کر چکا تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے دب کر شمالی پنجاب پر یلدوز کا حق بادشاہی تسلیم کر لیا تھا۔ درحقیقت آرام شاہ کی زندگی میں اور کچھ عرصے بعد تک اقتضائے مصلحت یہی تھا کہ شمالی پنجاب سے قطع نظر کر لی جائے کیونکہ ایسی حالت میں جبکہ سلطنت دہلی کی فوج کا بہتر و بیشتر حصہ لاہور میں آرام شاہ کے ساتھ مل گیا یا سرکش

[1] یہ مسلم ہے کہ شمس الدین، قطب الدین کا داماد تھا۔ لیکن یہ کہیں صاف صاف تحریر نہیں کہ یہ شادی کب ہوئی۔ تاہم طبقاتِ ناصری کی عبارت سے اتنا مترشح ہوتا ہے کہ شمس الدین کے دہلی میں تخت نشین ہونے کے بعد ہی یہ رسم ادا ہوئی تھی (طبقات صفحہ ۱۴۱)

اُمرا کے ساتھ مِل کر متفرق ہوگیا تھا اور خاص ہندوستان کے علاقوں میں جو فتنے اُٹھ رہے تھے، انھیں فرو کرنے کے لئے کافی سپاہ اور مصارف درکار تھے شمس الدین دہلی سے دور جا کر یلدُوز کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا جس کی قوت اُن دنوں عروج پر تھی[1]
دوسرے پنجاب کا ایک اور قدیم دعویدار ناصر الدین قباچہ تھا جس نے سمندر تک تمام سندھ پر تسلط کر کے اپنی قوت بڑھالی تھی اور ملتان کو مستقر بنا کے جب موقع ملتا اضلاع پنجاب پر قابض ہو جاتا تھا۔ مختصر یہ کہ اول اول سلطان شمس الدین کا فائدہ اسی میں تھا کہ ملک پنجاب سے دست بردار ہو کر یلدُوز کو اپنا دوست بنا لے ؛

اس موقع پر جو عہد نامہ ہوا تھا اس کی تفصیلی شرائط کسی تاریخ میں نہیں ملتیں لیکن طبقات ناصری کی عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تاج الدین یلدُوز نے پنجاب لے کر شمس الدین ایل تتمش کی بادشاہی اس طرح تسلیم کی تھی کہ گویا حکومت دہلی ابھی تک غزنی کی باج گزار ہے اور شمس الدین التمش نے بھی اُس وقت اس بارے میں خاموشی اختیار کر لی تھی لیکن اس واقعے کو چند ہی سال گزرے تھے کہ سلطان محمد خوارزم شاہ نے سنہ ۱۲۱۴ء میں غزنی پر قبضہ کر لیا اور تاج الدین یلدُوز کو وہاں سے ہٹ کر پنجاب میں آنا پڑا۔ پھر اُس ملک کو قباچہ کی فوجوں سے خالی کرانے کے بعد اُس نے اپنے شہنشاہی حقوق کی بنا پر حکومت دہلی سے بھی بعض مطالبات کئے جنھیں التمش نے رد کر دیا۔ اس وقت یلدُوز نے خاص دہلی پر لشکر کشی کی ؛

فریقین کا مقابلہ ترائین کے قریب اسی میدان میں ہوا جہاں کئی بار تلوار ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کر چکی ہے مگر اس مرتبہ اہل ہند نے شمالی حملہ آوروں کو شکست دی (۶۱۲ھ/۱۲۱۵ء)۔ تاج الدین زخم کھا کے گرفتار ہوا اور بداؤں میں نظر بند کر دیا گیا اور جیسا کہ جلد اول میں بیان ہو چکا ہے اسی قید میں اُس نے وفات پائی ؛ بایں ہمہ قبضۂ پنجاب کے متعلق قباچہ کے ساتھ عمال شمسی کا بہت دن تک جھگڑا ہوتا رہا حتیٰ کہ خود سلطان شمس الدین نے لاہور پر پیش قدمی کی اور دریائے بیاس کے کنارے سندھی فوج کو شکست دے کر مستقل طور پر پنجاب کو دوبارہ سلطنت دہلی کا صوبہ بنا لیا (۶۱۴ھ/۱۲۱۷ء) یہ گویا سلطان قطب الدین کے

---

[1] طبقات صفحہ ۱۷۰ - نیز دیکھو راورٹی حاشیہ صفحہ ۶۰۷۔

باب

نہایت عزیز منصوبے کی تکمیل تھی اگرچہ اس میں شک نہیں کہ جہلم کے پار ابھی تک سلطان کا حکم نہ چلتا تھا اور اس صوبے کی جنوبی مشرقی حدود بھی موجودہ منٹگمری کے ضلع سے آگے نہ تھیں ؛

فتوحات

لیکن سلطان کا اپنے سندھی رقیب کے تعاقب میں آگے نہ بڑھنا اس کی بیدار مغزی اور اصابت رائے کی دلیل ہے ۔ درحقیقت سلطنتِ دہلی کے لئے سندھ کی فتح قبضۂ بنگال سے مقدم نہ تھی۔ شمس الدین خالص ہندی فرماں روا بننا چاہتا تھا اور اور ممالک ہند کی سیاسی شیرازہ بندی کے واسطے، جو اس کا نصب العین تھی سندھ کی نسبت بنگالے کا سلطنت میں شامل ہونا زیادہ ضروری تھا۔ نظر برایں، گو اُس نے لاہور میں کچھ دن ٹھیر کر صوبۂ پنجاب کے نظم ونسق کو درست کیا جو پچھلی بدامنی کی بدولت یقیناً سخت ابتر ہو گیا ہوگا نیز اپنے بڑے بیٹے ناصر الدین محمود کو یہاں کا حاکم بناکر گویا قباچہ کے دعاوی کا خاتمہ اور اس ملک پر آئندہ حملوں کا معقول سد باب کر دیا اور چار سال کے بعد جب (۶۱۸ھ / ۱۲۲۱ء میں) محمد خوارزم شاہ کے بیٹے سلطان جلال الدین کو چنگیز خاں کے سامنے سے بھاگ کر ہندوستان میں پناہ ڈھونڈنی پڑی تو شمس الدین اسے پنجاب کی چپہ بھر زمین دینے کا بھی روادار نہ ہوا۔ بایں ہمہ اس نے صوبۂ لاہور کی حدود کو جنوب کی طرف یا مغرب میں جہلم سے آگے بڑھانے کی کوشش نہ کی اور سندھ پر فوج کشی کا ارادہ تھا بھی تو بنگال و رنتھنبور کی فتح تک اسے ملتوی کر دیا ؛

(۱) بنگالہ

بنگالے کے متعلق ہم پہلے پڑھ چکے ہیں کہ سلطان قطب الدین ایبک نے علی مردان خلجی کو ولایت لکھنوتی کی سند اور خلعتِ حکومت عنایت کر دیا تھا لیکن جب سلطان موصوف نے لاہور میں وفات پائی تو علی مردان خود مختار ہو گیا اور اس اعتبار سے بنگالے کا پہلا مسلمان بادشاہ وہی تھا۔ مگر مطلق العناں ہو کر وہ نہایت ظالم و خود پسند فرماں روا ثابت ہوا اور تین چار سال ہی میں اہل ملک اُس کی حکومت سے عاجز آگئے ۔ آخر خلجی امیروں نے ایکا کر کے اسے قتل کر دیا اور حسام الدین بن حسین خلجی کو بادشاہ بنایا جو سلطان غیاث الدین کے لقب سے مشہور ہے (۶۱۱ھ / ۱۲۱۴ء)[1] ؛

[1] ان بنگالی بادشاہوں کی تخت نشینی اور مدت حکومت کے سنین میں اختلاف ہے لیکن مختلف

باب

یہ بادشاہ سخاوت وجواں مردی، عدل ورعایا پروری میں اپنے پیش روکا نعم البدل تھا۔ اِس کے زمانے میں ملک بنگال نے بڑی رونق پائی اور شہر لکھنوتی اہلِ علم وفن کا مرجع بن گیا۔ اُس کی وفات کے پندرہ سولہ برس بعد جب صاحب طبقات ناصری اِن علاقوں میں آیا، تو اس کے انتظام اور رفاہ عام کے بہت سے آثار ملک میں موجود اور اُس کی خوبیوں کے قصّے زبان زد خلائق تھے، خود سلطان دہلی اس بنگالی فرماں روا کے اوصاف کا دل سے معترف تھا[1] اور عجب نہیں کہ غیاث الدین کی یہ ہردلعزیزی بھی ان بادشاہوں کی پہلی مصالحت کا ایک سبب ہوگئی ہو۔کیونکہ گو بہار کو سلطان شمس الدین بنگالے سے جدا کر کے ایک علٰحدہ صوبہ بنا دینا چاہتا تھا لیکن بنگال خاص کے علاقے میں اُس نے غیاث الدین کو ایک باج گزار امیر کی حیثیت سے بخوشی بحال رہنے دیا؛۔ شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ اودھ میں اپنی قوت مستحکم کرنے کے بعد ایلتتمش نے بعض اُمرا کو بہار پر حملہ کرنے کا حکم دیا تاکہ آئندہ بنگالے پر پیش قدمی کرنے میں آسانی ہو۔ چنانچہ جب یہاں کے باموقع مقامات پر اُمرائے سلطانی کا قبضہ ہوگیا تو خود سلطان نے وسیع پیمانے پر فوج کشی کی اور ۶۲۲ھ ۱۲۲۵ء میں شہر لکھنوتی کے قریب پہنچ گیا۔ لیکن کسی بڑی لڑائی کی نوبت نہیں آئی تھی کہ فریقین میں صلح ہوگئی۔ غیاث الدین خلجی نے خراج کے طریق پر بہت سا روپیہ اور اڑتیس ہاتھی نذر کئے اور عہد کیا کہ آئندہ ملک میں سکہ اور خطبہ سلطان شمس الدین کے نام کا رائج ہوگا۔ جس نے اپنی طرف سے غیاث الدین کو حکومت بنگالہ پر بحال کر دیا؛

معلوم نہیں اس معاہدے میں صوبہ بہار کے متعلق بھی کوئی قرارداد ہوئی تھی یا نہیں۔ سلطان شمس الدین کا ارادہ صاف طور پر ظاہر ہوچکا تھا کہ وہ اسے سلطنت دہلی کا ایک علٰحدہ صوبہ بنانا چاہتا ہے۔ چنانچہ واپسی میں اس نے اپنے ایک امیر ملک عزالدین کو یہاں کا حاکم مقرر کر دیا تھا۔ لیکن غیاث الدین کو

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ شواہد وقرائن سے راقم الحروف کی رائے میں ۶۱۶ھ ہی غیاث الدین کا سالِ جلوس ہے؛

[1] طبقات ناصری صفحہ ۱۶۳۔

یہ نقصان گوارا نہ ہوا اور جس وقت سلطان راجپوتانے میں مصروف جنگ تھا غیاث الدین خلجی نے بہار پر فوج کشی کی (۶۲۳ھ ۱۲۲۶ء)۔ عزالدین کو بھاگ کر اودھ میں پناہ لینی پڑی جہاں اب ناصر الدین محمود باپ کی طرف سے صوبے کا حکمراں تھا۔ وہ پنجاب میں اپنی انتظامی قابلیت کے جوہر دکھا چکا تھا مگر اس موقع پر اس کی سپہ سالاری کا کمال ظاہر ہوا کہ سلطان کی طرف سے اجازت اور کمک ملتے ہی اس نے لکھنوتی پر یلغار کی اور اس سے قبل کہ غیاث الدین سرحد آسام سے واپس آئے وہ اس کے پائے تخت پر قابض ہو گیا۔ پھر جب غیاث الدین خلجی اپنی سرحدی لڑائیاں چھوڑ کر جس قدر جلد ممکن تھا، لکھنوتی آیا تو ناصر الدین محمود نے اس کو شہر کے باہر سخت شکست دی اور وہ اور اس کے بہت سے امرا گرفتار ہو گئے (۶۲۴ھ ۱۲۲۷ء)

اس معرکہ آرا فتح نے بنگالے کی نیم آزاد بادشاہی کا بھی خاتمہ کر دیا اور دریائے برہم پترا سرحد آسام تک یہ شرقی علاقے سلطنت دہلی کا صوبہ بن گئے۔ دو بغاوتوں کے سوا آئندہ ایک صدی سے زیادہ عرصے تک یہاں کے صوبہ دار سلاطین دہلی کے فرماں بردار رہے اور اسی سیاسی تعلق نے رفتہ رفتہ تمام شمالی ہندوستان کے باشندوں میں ہم ملک ہونے کا وہ احساس پیدا کیا جسے "اتحاد اہل ہند" کی موجودہ آرزو کا پہلا تخم کہہ سکتے ہیں۔ دنیا کے اور ملکوں میں بھی مطلق العناں بادشاہوں نے بالواسطہ یہ خدمت انجام دی ہے لیکن سلاطین دہلی کی ممتاز خصوصیت اور عظمت کا

لہ ان میں پہلی بغاوت وہ تھی جو شہزادۂ ناصر الدین محمود کی وفات (۶۲۶ھ) پر غیاث الدین کے بیٹے اختیار الدین بلکا خلجی نے بپا کی اور خود سلطان شمس الدین التمش نے لکھنوتی جا کر اسے فرو کیا (۶۲۸ھ ۱۲۳۱ء) باغی سردار گرفتار کر لیا گیا اور بنگالے کی صوبہ داری ملک عزالدین کو عنایت ہوئی جو پہلے بہار کا صوبہ دار تھا۔ ان تمام واقعات کو انفنسٹن صاحب نے اپنی تاریخ ہند (صفحہ ۳۶۶) میں عجیب طرح لکھا ہے اور اسے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا بنگال کا پہلا فاتح محمد بن بختیار خلجی ابھی تک زندہ تھا اور التمش کی یہ لڑائیاں اسی کے ساتھ ہو رہی تھیں! طرفہ یہ کہ بعد کے تمام انگریز محقق بھی اسی قول کو نقل کر دیتے ہیں اور اس بات سے بالکل بے خبر ہیں کہ محمد بختیار خلجی مذکورۂ بالا واقعات سے ۲۴ برس پہلے فوت ہو چکا تھا۔

باب

اس لئے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اُن کی انتظامی قابلیت اور منصوبۂ شہنشاہی نے اتنے وسیع براعظم کی شیرازہ بندی کی۔ اور اس منصوبے کا اظہار آگے چل کر ہم خود اُلغ خان بلبن کی زبانی سنیں گے۔

۲۔ فتح رنتھمبور (مشرقی راجپوتانہ) ادھر اس دو سال کے عرصے میں خود سلطان التتمش نے راجپوتانے کے دو مشہور و مستحکم قلعے فتح کئے جنھیں جنگجو راجپوتوں نے اپنا مرکز بنا لیا تھا واضح رہے کہ گو ہند کے باشندے اسلامی فتوحات کے سیلاب کو ہندوستان میں پھیلنے سے نہ روک سکے تھے لیکن بہت سے غیرتمند شرفا کو پردیسی فاتحین کے آگے سر جھکانا گوارا نہ تھا۔ آزادی کی بیش بہا دولت کے سامنے زر و زمین، کسی شے کی وہ پروا نہ کرتے تھے اور ہندوستان کے زرخیز علاقے چھوڑ چھوڑ کر اُس ریگستانی خطے میں آبسے تھے جسے آج کل ہم راجپوتانہ یا راجستان کہتے ہیں۔ اس نقل مکانی کی بدولت، نہ صرف اس ملک کی آبادی بڑھتی رہی بلکہ وہ ہند و قوم کے بہترین سپاہیوں کا مسکن بن گیا تھا اور اُس پر تسلط حاصل کرنا کچھ آسان بات نہ تھی۔ گرمی کی شدت اور زمین کے دشوار گزار و کم حاصل ہونے کی وجہ سے بھی مسلمان حملہ آوروں کو یہاں کے صحرا و کوہستان فتح کرنے کا شوق نہ ہو سکتا تھا لیکن ریت کے ٹیلوں اور کوہ اراولی کی چوٹیوں کے پار گجرات و مالوے کے سرسبز میدان تھے اور دہلی سے وہاں پہنچنے میں مشرقی اور جنوبی راجپوتانے سے گزرے بغیر چارہ نہ تھا۔ پس یہی وہ رستے تھے جن پر سلاطین دہلی کو بار بار حملہ کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ اور بار بار قلعہ رنتھمبور و چتوڑ کی زمین بہادروں کے خون سے رنگین ہوئی۔

یاد رکھنا چاہئے کہ اس زمانے میں کسی بڑے اور مرکزی قلعے کو فتح کرنے کے معنی یہ تھے کہ ساری ریاست پر فاتح کا قبضہ ہو گیا۔ کیونکہ ضرورت کے وقت انھیں سنگین حصاروں میں اُس علاقے کی تمام جنگی قوت جمع ہو جاتی تھی اور اسی لئے اُن کے بنانے میں دفاعی جنگ کی ضروریات کو پیش نظر رکھا جاتا تھا۔ رنتھمبور اسی قسم کا مستحکم قلعہ تھا جس کے آثار دیکھکر آج بھی اس کی تسخیر کی دشواریوں کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مشرقی راجپوتانے کے میدانی قطعات میں بھی جا بجا پہاڑیاں اُبھری ہوئی ہیں۔ ایسی ہی ایک بلند پہاڑی پر یہ سنگین قلعہ تعمیر کیا گیا تھا اور خود اُس کا قدیم نام "رن استھمبا پور"، یعنی جنگی ستون کا مقام[1] گواہی

---

[1] گزے ٹیئر۔ جلد ۲۱ صفحہ ۲۲۵۔

باب ۱

نے اس کی سنگینی کے متعلق جو روایت لکھی ہے وہ بے بنیاد نہ ہوگی[1] پرتھی راج کے عہد میں یہ قلعہ ریاست اجمیر کے توابع میں داخل ہوگیا تھا[2] اور اسی لئے جب یہ ریاست سلطان معز الدین کی باج گزار ہوئی تو رنتھنبور بھی، غالباً جنگ کئے بغیر مسلمانوں کے قبضے میں آگیا۔ لیکن جب اجمیر پر مسلمانوں کا بلاواسطہ تصرف ہوا اور آزادی پسند راجپوت کسی طرح انھیں وہاں سے نہ نکال سکے تو قرینہ کہتا ہے کہ اس وقت انھوں نے رنتھنبور کو اپنا جنگی مستقر منتخب کیا اور مسلمانوں کی مختصر فوج کو جو یہاں مقیم تھی نکال کر کسی نہ کسی طرح قلعے پر قابض ہوگئے۔ اسی وقت سے یہ قلعہ گویا تمام مشرقی راجپوتانے کے آزاد و جنگجو قبائل کا مامن بن گیا اور چونکہ اس کے قریب ہی جنوب میں اراولی پربت کی ایک شاخ پھیلی ہوئی ہے لہٰذا رنتھنبور کو نہایت عمدہ جنگی مورچہ کہہ سکتے ہیں۔ جسے عقب سے بہ آسانی کمک پہنچائی جاسکتی تھی اور مدافعت کے ناکام رہنے کی صورت میں بھی انھی پہاڑیوں میں پناہ لے سکتے تھے جہاں دشمن کی رسائی بہت دشوار تھی۔

مسلمانوں کا منصوبہ راجپوتانے میں۔

لیکن مسلمانوں کی طرف سے اگر اول اول اس قلعے کو دوبارہ لینے میں بے پروائی برتی گئی تو اس کا ایک سبب تھا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ راجپوتوں کو جبراً محکوم بنانا بہت سی قیمتی جانیں دے کر ایک کم حاصل زمین کو خریدنا ہے اور جب تک ہندوستان کے زیادہ زرخیز علاقے موجود تھے، انھیں یہ پُرخطر سودا کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ البتہ جوشِ سپہ گری کا مقتضی یہ تھا کہ راجپوتانے کے سرکش منچلوں کو اپنی تلوار کا جوہر دکھا دیا جائے کہ مطیع نہ ہوں تو بھی کم سے کم مسلمانوں کی جنگی برتری کا ان کے دل پر رعب بیٹھ جائے اور اس شوکت نمائی اور اظہار شجاعت کی تہ میں دو اہم سیاسی

[1] صاحب طبقات لکھتے ہیں کہ ہندی تاریخوں کا بیان ہے کہ اس قلعہ پر ازمنۂ گزشتہ میں ستر سے زیادہ بادشاہوں نے فوج کشی کی مگر کوئی بھی اسے فتح نہ کرسکا۔ صفحہ ۱۷۱۔

[2] گزیٹیئر، جلد ۲۱، صفحہ ۲۳۵۔ سلطان معز الدین کے زمانے میں رنتھنبور پر مسلمانوں کا قبضہ ہونا تاج المآثر کی عبارتوں سے ثابت ہے۔ راورٹی اس بارے میں کچھ شبہہ ظاہر کرتا ہے۔ (حاشیہ صفحہ ۶۱۱) لیکن گزیٹیئر کی مذکورۂ بالا اطلاع، صاحب تاج المآثر کے قول کی بالواسطہ توجیہ و تصدیق کے لئے کافی ہے۔ ۱۲

مصلحتیں مرکوز تھیں۔ ایک تو یہ کہ گجرات و مالوہ کا راستہ ایک حد تک صاف رہے اور دوسرے یہ کہ راجپوتوں میں نہ کبھی اتنی قوت آسکے نہ یہ جرأت کہ کسی وقت میں خود مسلمانوں کو اُن کے حملے کا اندیشہ پیدا ہو جائے۔ عہد اکبری تک، راجپوتانے کے متعلق، مسلمان بادشاہوں کا اصولِ عمل یہی تھا اور باج گزاری کا اقرار لینے کے سوا انھوں نے یہاں کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا استیصال کر دینے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اور اُن کے اعلیٰ تدبّر اور موقع شناسی کی اس سے بہتر شہادت کیا ہوگی کہ راجپوتانے کے ساتھ جو طریق عمل انھوں نے اختیار کیا تھا، صدہا سال گزرنے کے باوجود، ہندوستان کے موجودہ فرماں روا بھی اصولاً اُسی پر کاربند ہیں! طرفہ تر یہ کہ جنگی ضروریات کے لئے راجپوتانے میں افواج شاہی کا جو سب سے بڑا مرکز سلطان قطب الدین ایبک نے قرار دیا تھا (یعنی اجمیر) آج بھی سرکار انگریزی نے اس پر براہ راست اپنا قبضہ رکھا ہے اور حقیقت میں راجپوتانے کی یہی وہ کنجی تھی جس کے ہاتھ میں آجانے کی بدولت مسلمانوں کو نہ رنتھنبور کے فوجی اجتماعات کی چنداں پروا ہوتی تھی نہ منڈور و چتوڑ کے استحکامات کی اور جب دوسری طرف سے فرصت ملتی تو اسی مرکز جنگ سے وہ اپنی فوجیں ہر گوشۂ ملک میں پھیلا دیتے تھے! التتمش نے بھی رنتھنبور کے دوبارہ لینے کی خاطر اپنی مہم بنگال کو ملتوی کرنا پسند نہیں کیا تھا مگر اُدھر سے فرصت ہوئی تو وہ اِدھر بڑھا اور چند مہینے کے محاصرے کے بعد یہ مستحکم قلعہ مسخر ہوگیا! (۶۲۳ھ / ۱۲۲۶ء)

۳۔ فتح منڈور

اسی سلسلے میں افواج شمسی نے مغربی راجپوتانے پر چڑھائی کی اور (۶۲۴ھ / ۱۲۲۷ء) میں یہاں کا سب سے مشہور و مستحکم قلعہ منڈور فتح کرلیا، یہ قلعہ، یا قلعوں کا مجموعہ ریاست مارواڑ کا قدیم صدر مقام اور پریہار قوم کے راجپوتوں کا مرکز تھا۔ اجمیر سے تقریباً سو میل مغرب میں موجودہ جودھپور کے قریب اس کے کھنڈر آج بھی گزشتہ وسعت و سنگینی کی گواہی دیتے ہیں اور شمالی ہند کے مشہور آثار قدیمہ میں اُن کا شمار ہے[1]! افسوس ہے کہ "غنائم بسیار" کا ذکر کرنے کے سوا صاحب طبقات ناصری

---

[1] گزیٹیر۔ جلد ۱۷، صفحہ ۱۰، بحوالہ "آرکیولوجکل سروے اوف نورذرن انڈیا" کرنل ٹاڈ نے بھی

یا اور کسی فارسی مؤرخ نے اِس فتح کے اسباب و واقعات کی تفصیل نہیں لکھی۔ اور تاریخ فرشتہ کے مولف یا کاتب نے تو غلطی سے منڈور کی بجائے اسے منڈو (یا مانڈو) بنا دیا ہے جو مالوے میں واقع تھا؛ تاہم طبقات اور مراۃ جہاں کی مختصر عبارت سے اتنا مترشح ہوتا ہے کہ ان فتوحات سے "جنوبی سوالک" یا راجپوتانے کے اُن سرحدی اقطاع کو محفوظ کرنا پیش نظر تھا جو براہ راست سلاطین دہلی کی عملداری میں داخل ہو گئے تھے اور ناگور و اجمیر ان کے مشہور مستقر تھے۔

راجپوتانے کی مذکورۂ بالا کامیابیوں نے سلطنت دہلی کے اندرونی علاقوں کو اتنا محفوظ کر دیا تھا کہ بظاہر اقطاع شاہی پر اب کسی بیرونی حملے کا اندیشہ نہ رہا اور اقبال مند سلطان کو سندھ پر فوج کشی کی فرصت مل گئی۔ بعض فارسی تاریخوں میں اس حملے کا قریبی سبب یہ بتایا گیا ہے کہ چنگیز خانیوں سے شکست کھا کر خوارزمی فوج کے ایک حصے نے سندھ کے شمال مغربی اضلاع میں پناہ لی تھی ناصر الدین قباچہ نے وہاں بھی انھیں چین نہ لینے دیا اور شکست دے کر اپنے ملک سے نکال دیا۔ ان شکست خوردہ اور مظلوم سپاہیوں نے سلطان دہلی سے فریاد کی اور وہ قباچہ سے ان کا انتقام لینے پر آمادہ ہو گیا۔ ۴ فتوحات سندھ

لیکن درحقیقت یہ محض حیلہ تھا اور لڑائی کی اصلی وجہ اُسی قدیم رقابت کو سمجھنا چاہیئے جس کی بدولت پہلے قطب الدین اور شمس الدین کے ساتھ قباچہ کی بار بار لڑائیاں ہوئیں۔ ۱۴ ۶ھ / ۱۲۱۷ء کی جنگ کے بعد سے قباچہ نے ملک پنجاب پر کوئی پیش قدمی نہ کی تو اس کا ایک سبب تو ظاہر ہے کہ اب اُسے شمسی افواج پر عہدہ برآ ہونے کی امید نہ تھی اور سلطان شمس الدین کے عمدہ انتظام نے حملوں کا سدّ باب کر دیا تھا۔ مگر اس کے علاوہ، تھوڑے ہی عرصے بعد جماعت ہائے مغل نے بھی جن کی حیثیت اب تک

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ ۱۸۱۹ء یعنی سیاحت راجپوتانہ کے دوران میں منڈور کی مشہور "دوہری مونگ کی دال" کھائی اور یہاں کے کھنڈروں کی سیر کی تھی دیکھو ٹاڈ۔ جلد اول صفحات ۷۶۲ تا ۷۷۰۔

۱؎ طبقات ناصری، صفحہ ۱۷۲۔ راورٹی، حاشیہ ۶۱۱۔

لٹیروں کی سی تھی ممالک سندھ کا راستہ دیکھ لیا تھا اور اُن خوفناک دشمنوں سے قباچہ کو خود اپنا ملک بچانے کی پڑی تھی؛ غرض سلطنتِ دہلی کے اِس پرانے حریف کی طرف سے اب ہندوستان پر حملے کا خطرہ نہیں تھا البتہ خود سلطان شمس الدین کی جنگی قوت اور اسی کے ساتھ تمنائے کشور کشائی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ وہ ملکِ سندھ کو فتح کرنے کا آرزو مند تھا اور اُس "منصوبۂ بادشاہی" کو، جو اُسے قطب الدین سے ترکے میں ملا تھا، ترقی دے کر سلطنتِ دہلی کا نیا نقشہ بنانا چاہتا تھا جس میں وادیٔ سندھ سے وادیٔ برہم پتر تک ایک ہی بادشاہ کی عملداری نظر آئے۔

۶۲۵ھ (۱۲۲۸ء) کے اوائل میں افواجِ دہلی نے حرکت کی اور بھٹنڈے سے مغرب کی طرف رُخ کیا۔ یہاں سے اُچھ کوئی دو سو میل دور دریائے ستلج پر واقع تھا اور شہر سے باہر نکل کر اسی دریا کے کنارے ناصر الدین قباچہ نے حملہ آوروں کو روکنے کی تیاریاں کی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے دریا کے پیچ و خم نے اُس کے پڑاؤ کو نہایت محفوظ بنا دیا تھا اور خیمہ گاہ کے سامنے بہت سی کشتیاں موجود تھیں کہ ضرورت کے وقت دریا کی نزدیکی سے پورا فائدہ اٹھایا جاسکے؛ لیکن اقبالِ شمسی نے مدافعت کی تمام تدابیر کو درہم برہم کر دیا۔ اہلِ سندھ جمعے[1] کی نماز پڑھ کر خیموں کو آرہے تھے کہ تیز یا ہرکاروں نے آکر خبر دی کہ لاہور کے حاکم ملک نصیر الدین ایتمر کی فوج ملتان کے قریب پہنچ چکی ہے! شمالی سندھ کا یہ پائے تخت اور سرحد کا سب سے بڑا جنگی مرکز اُچھ سے صرف پچاس پچپن میل شمال میں واقع ہے اور اس کے گھر جانے کے معنی یہ تھے کہ قباچہ کو ادھر سے کوئی کمک نہ مل سکے گی اور دشمن جس وقت چاہے گا تیز کوچ کر کے خاص اُچھ پر شمال مغرب کی طرف سے حملہ کر دے گا۔ چونکہ سندھی فوج کا بڑا حصہ شہر سے دور مشرق میں خیمہ زن تھا اور اُدھر سے افواجِ شاہی منزل بہ منزل بڑھی چلی آتی تھیں لہٰذا انھیں روکنا

---

[1] یہ غالباً ماہ صفر ۶۲۵ھ کے پہلے ہفتے کا ذکر ہے۔ (دیکھو طبقاتِ ناصری صفحہ ۱۷۲، انیز راورٹی، حواشی صفحات ۶۱۲، ۶۱۳ وغیرہا) تاج المآثر نے سندھ کی اس لشکر کشی کو ۶۲۴ھ کا واقعہ لکھا ہے۔ بعد کی تاریخوں میں بھی مختلف سنین درج ہیں لیکن صاحبِ طبقاتِ ناصری اُس وقت خود اُچھ میں موجود تھا اور اسی فتح کے بعد سلطان شمس الدین کے ہمراہ دہلی آیا لہٰذا اُس کی تاریخیں زیادہ قابلِ اعتبار ہیں۔

اور اسی کے ساتھ اُچھ کے شمالی مغربی پہلو کی حفاظت کرنا دشوار ہوگیا تھا خاص کر اس وجہ سے، کہ ان دنوں دریائے ستلج اُچھ کے مغرب میں بہتا تھا اور ملتان سے پیشقدمی کرنے والے کے راستے میں کوئی دشوار گزار مقام نہیں تھا۔ خلاصہ یہ کہ ملک التتمش کی پیش قدمی نے مدافعین کے سارے منصوبے پر پانی پھیر دیا اور قباچہ کو سلامتی اسی میں نظر آئی کہ جس قدر جلد ممکن ہو اس دوطرفہ زد سے بچ کر، بہت دور جنوب میں بھکر ہٹ آیا۔

مگر اس ہل چل میں اُس کا فوجی نظام اس قدر بگڑ گیا تھا کہ آیندہ بھی کسی میدانی جنگ کی نوبت نہیں آئی۔ تین مہینے کے محاصرے کے بعد اِدھر اُچھ کی فوج نے ہتیار ڈال دئے (جمادی الاول ۶۲۵ھ ۱۲۲۸ء) اور اُدھر وہ خود کشتی میں بیٹھ کر بھکر سے بھی فرار ہونا چاہتا تھا کہ کشتی دریائے سندھ میں ڈوب گئی۔ ایک روایت یہ ہے کہ اس نے خود ہی دریا میں کُود کر اپنی جان دے دی؛ غرض مملکت سندھ پر سلطان دہلی کا تسلط ہوگیا اور سمندر تک سندھ کے جنوبی، اور مکران تک مغربی، اضلاع میں حکومت دہلی کی عملداری قائم کرنے کے لئے اپنے مشہور وزیر نظام الدین جُنیدی اور لائق غلام ملک تاج الدین کزلک کو یہاں چھوڑ کر، فاتح بادشاہ نے دارالملک دہلی کو مراجعت کی۔

خلیفہ بغداد کی سند

شاہانِ موریا کے بعد، جن کی حدود سلطنت ایک حد تک ظنّی ہیں، یہ پہلا موقع تھا کہ سندھ "شمالی ہندوستان" میں داخل ہوا۔ لیکن اہل دہلی نے ان سندھی فتوحات کی خاص طور پر جو خوشی منائی اُس کا بڑا سبب دوسرا تھا وہ یہ کہ ہندوستان بھر میں صرف دولت سندھ کو سلطنت دہلی کی ہمسری کا دعویٰ رہ گیا تھا اور کم سے کم پنجاب کے بادشاہی عمّال ہمیشہ اس مغربی رقیب کی جانب سے اندیشہ مند رہتے تھے۔ قباچہ کی موت اور سندھ کی خودمختار قوت کے خاتمے سے یہ خلش مٹ گئی اور اب کوہستان سلیمان سے کوہستان کھاسی (آسام) تک اور ہمالیہ سے بندھیاچل تک وہ جدھر نظر ڈالتے تھے، بالواسطہ یا بلاواسطہ دہلی کی عملداری نظر آتی تھی۔ اور جو رئیس و راجہ آزادی کا دم بھرتے تھے اُن میں بھی ظاہرا کوئی اتنا قوی نہ تھا کہ شمالی ہندوستان کی اِس نوخیز سلطنت کو اُس کی جانب سے حملے کا خوف ہوتا۔ اِدھر اُسی زمانے میں خلیفۂ بغداد کے سفیر کشورِ ہند کی بادشاہی کی سند اور خلعت لے کر دہلی آئے جس نے

باب ۱

جشنِ فتح کی دھوم دھام کو دو بالا کر دیا کیونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ خلافت بغداد نے یا بہ الفاظ دیگر، دنیائے اسلام نے ہندوستان کی مستقل اور جداگانہ بادشاہی تسلیم کی ورنہ کچھ عرصے پہلے تک وہ سلطنتِ غزنی کی تابع سمجھی جاتی تھی۔

واضح رہے کہ گو صحیح معنی میں صرف قریب کے چند صوبوں پر خلیفۂ بغداد کی حکومت رہ گئی تھی۔ تاہم ابھی تک مسلمانوں میں اس کا رسمی احترام باقی تھا اور نہ صرف ممالک ایشیا بلکہ خلافتِ فاطمیہ کے زوال کے بعد (۵۶۷ھ / ۱۱۷۱ء) اکثر افریقی ممالک میں بھی (جہاں پہلے اسمٰعیلیوں کا دور دورہ تھا) خطبوں میں اول خلیفۂ بغداد کا اور اس کے بعد مقامی فرماں روا کا نام لے کر دعائے خیر مانگی جاتی تھی نیز جو نیا ملک مسلمان فتح کرتے یا کوئی نیا بادشاہ کہیں تخت نشین ہوتا اور خلافتِ بغداد کی جانب سے بھی اُسے سند بادشاہی اور خلعت حکمرانی مل جاتا تو وہ اس کو اپنی عزت تصور کرتا تھا۔ یہی رسم تھی جو ۶۲۶ھ / ۱۲۲۹ء میں بغداد کے سفیروں نے پائے تخت دہلی میں ادا کی۔ دوسرے اس سفارت نے ہند اور دیگر اسلامی ممالک میں سلسلۂ ارتباط کو قوی کر دیا اور ایران و عراق کے اہل علم اور تاجر کثرت سے ہندوستان میں آنے لگے۔ تیس برس بعد جب چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو خاں نے دار الخلافت بغداد کو تاراج و خراب کیا تو اس وقت دہلی بھی اس کے ماتم گساروں میں تھی۔

دوسری فصل جانشینانِ التتمش اور مغلوں کی یورشیں

آخری فتوحات شمسی۔

۶۲۸ھ / ۱۲۳۱ء میں بنگالے کی شورش فرو کرنے کے بعد جس کا اشارہ پہلے آ چکا ہے، شمس الدین نے مالوے کی فتح کا ارادہ کیا۔ آج کل یہ ملک "وسطِ ہند" میں شامل ہے اور گو سلطان معز الدین سام ہی کے زمانے میں اس کے بعض شمالی اور مغربی اقطاع فتح ہو گئے تھے لیکن جنوب میں خاص مالوے تک غزنوی یا دہلوی سپاہ کا قدم نہ آیا تھا اور شمال میں راجہ گوالیار بھی، جس نے بہاء الدین طغرل سے بچنے کے لئے قطب الدین ایبک کی اطاعت قبول کر لی تھی (صفحہ ۱۳۷) خود مختاری کا دم بھرنے لگا تھا۔ لہٰذا افواج شمسی نے بڑھ کر پہلے اسی قلعے کا محاصرہ کیا اور دس گیارہ مہینے تک اسے گھیرے پڑی رہیں

آخر ماہِ صفر ۶۳۱ھ (۱۲۳۴ء) میں راجہ چھپ کر فرار ہوگیا اور باقی ماندہ محصورین نے، جو غالباً فاقہ کشی میں مبتلا تھے، قلعے کے پھاٹک کھول دئے۔ "مالوہ خاص" یعنی موجودہ وسط ہند کے جنوبی ٹکڑے کی فتح دو سال بعد (۶۳۲ھ ۱۲۳۴ء میں) تکمیل کو پہنچی اور بھیلسا اور اجین کی تسخیر سے سلطنت دہلی کی جنوبی حدود دریائے نربدا تک وسیع ہوگئیں۔

بیان کرتے ہیں کہ مالوے کے اِن شہروں میں دو قدیم بت کدے تھے جنھیں سلطان شمس الدین نے منہدم کرا دیا اور اجین کی بعض برنجی مورتوں کو جن میں راجہ بکرماجیت کا بُت بھی تھا، اُٹھوا کر دہلی لے گیا۔[۱] تاریخ ہند میں ایسی بُت شکنی کی خال خال مثالیں اور بھی موجود ہیں۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ یہ مذہبی تعصب ہمیشہ کسی خاص وجہ اشتعال یا ملکی مصلحت پر مبنی ہوتا تھا۔ ایک صورت یہ بھی تھی کہ جب کسی مفرور یا مقتول راجہ کے خالی محلات پر مسلمان قبضہ اور ان کے بادشاہ یا اُمرا ان میں سکونت اختیار کرتے تو محلات کے اندر راجہ کے جو (خانگی) مندر یا معابد ہوتے تھے، ان کو حسبِ ضرورت اسلامی مساجد کی صورت میں تبدیل کرلیا جاتا تھا، ورنہ مذہبی جبر کی اسلامی شریعت نے کہیں بھی اجازت نہیں دی بلکہ ممانعت کی ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ اپنے مذہب کا سب سے زیادہ جوش رکھنے کے باوجود مسلمانوں نے، دیگر فاتحین کی نسبت غیر قوموں کو سب سے زیادہ مذہبی آزادی دی تھی۔ عرب فاتحین کی مذہبی رواداری کو اب یورپ کے غیر مُسلم محقق بھی عام طور پر تسلیم کرنے لگے ہیں۔ ہندوستان میں اسلامی حکومت کا جو طرزِ عمل رہا اس پر موقع بہ موقع مختصر طور پر ہم آئندہ بحث کریں گے۔ یہاں اسی قدر لکھنا کافی ہے کہ اگر ہندوستان کے سب یا اکثر فرماں روا مذہبی جبر و تشدد سے کام لیتے رہتے تو چھ سو برس کی اسلامی حکومت کے بعد اِس ملک میں ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے سگنی زیادہ نہ ہوتی۔ خود سلطان شمس الدین کی جن فتوحات کا ذکر ہمارے پیشِ نظر ہے۔ اُن میں قلعۂ منڈور کا پُرانا مندر[۲] اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ مسلمان بادشاہوں کو ہر مندر کے توڑ دینے کا ایسا شوق نہ تھا جیسا کہ اس زمانے کی انگریزی تاریخوں میں دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بھیلسا کے بالکل

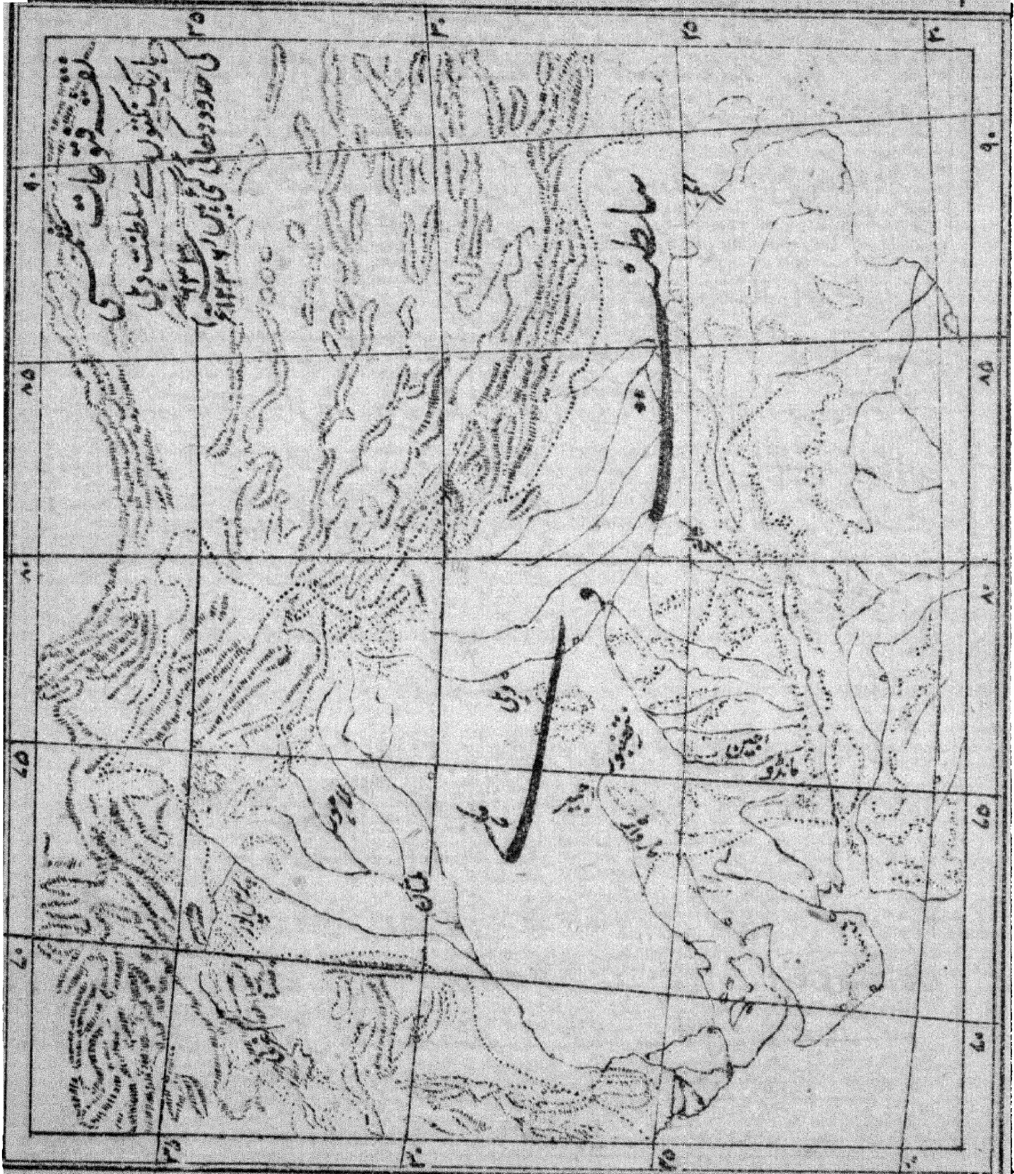
*

[۱] طبقات ناصری صفحہ ۱۷۶۔ نیز دیکھو منتخب التواریخ صفحہ ۶۷۔

[۲] اِس مندر کے کتبے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کم سے کم سنہ ۱۲۱۰ء یا ۶۰۷ھ

باب ۲

قریب بھی بودھ مت والوں کے کئی قدیم ٹوپ (گنبد) اور زیارت گاہیں موجود ہیں شمس الدین
یا بعد کے کسی اسلامی فرماں روا نے انھیں خواہ مخواہ تڑوا کر مفت کا "ثواب" حاصل نہیں کیا!



التتمش کے جانشین۔

دکن کو چھوڑ کر، جو عرصے تک شمالی ہند سے جداگانہ ملک سمجھا جاتا رہا، اب تقریباً

تمام ہندوستان "ایک چھتر کے نیچے" تھا۔ ہر جگہ "اَلْکِبْرِیَاءُ لِلّٰہِ" کے پھریرے اڑ رہے تھے جو رایاتِ شمسی کی توقیع تھی اور جن علاقوں میں براہِ راست سلطان کی عملداری نہ تھی وہاں کے رئیس بھی رسمی طور پر سلطنت دہلی کے باج گزار یا زیر اثر سمجھے جاتے تھے۔ اس شہر نے صرف پچیس تیس برس میں وہ تعجب انگیز مرکزیت حاصل کر لی تھی کہ گو سلطان شمس الدین کی وفات (۶۳۳ھ ؍ ۱۲۳۶ء) کے بعد کئی سال تک کوئی ایسا فرماں روا تخت پر نہ بیٹھا جو اس کی جانشینی کا حق ادا کرتا اور اپنے نیم آزاد صوبہ داروں کو پوری طرح قابو میں رکھ سکتا، بایں ہمہ دار الملکِ دہلی کی سیاسی اہمیت میں زیادہ فرق نہ آیا اور طاقتور ترک امرا کی باہمی آویزش یا بادشاہ سے بغاوت بھی سلطنت کی پیوستگی میں ایسا رخنہ پیدا نہ کر سکی کہ مختلف صوبہ داروں کو دہلی کا تعلق توڑ کر علانیہ خود مختار بن جانے کی جسارت ہوتی۔ مگر اس سے کبیر خاں ایاز حاکم ملتان مستثنیٰ ہے جس نے مغلوں کی یورش کے زمانے میں وسیع پیمانے پر دفاعی جنگ کی تیاریاں کیں اور ساتھ ہی اپنی خود مختار بادشاہی کا اعلان کر دیا (۶۲۹ھ ؍ ۱۲۴۲ء) دہلی میں اسوقت سلطان شمس الدین کا تیسرا جانشین فرماں روا تھا۔ مگر صرف چھ برس میں تین بادشاہوں کا عزل و نصب ہی اس بات کی دلیل ہے کہ ان میں اس منصب جلیل کی اہلیت نہ تھی۔ درحقیقت سلطان مرحوم کی اولاد (ایک بیٹی اور آٹھ بیٹوں) میں اگر کوئی حکمرانی کی قابلیت رکھتا تھا تو وہ اس کا بڑا بیٹا ناصر الدین محمود فاتح بنگال تھا۔ اس نے باپ کی زندگی میں وفات پائی اور سلطان کو دوسرے بیٹوں کی طرف سے اتنی بدظنی تھی کہ اس نے اول اول اپنی بیٹی سلطانہ رضیہ کی ولی عہدی کا اعلان کر دیا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے آخری بیماری میں وہ اپنے منجھلے بیٹے رکن الدین سے رضامند ہو گیا اور جب اس کا انتقال ہوا تو امرا نے بھی اسی شہزادے کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ (شعبان ۶۳۳ھ ؍ ۱۲۳۶ء)

رکن الدین بالکل لاابالی مزاج کا امیر زادہ تھا اور بادشاہی ملتے ہی لہو و لعب

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ یعنی سلطان شمس الدین کی تسخیر منڈور سے پہلے کا بنا ہوا ہے۔ گزے ٹیر۔ جلد سترہ صفحہ ۱۱۱۔ بھیلسا کی نواح میں جو بودھ مت کے "ٹوپ" موجود ہیں ان کا ذکر اس تاریخ کی جلد اول میں ہماری نظر سے گزر چکا ہے۔ نیز دیکھو گزے ٹیر جلد آٹھ صفحہ ۱۰۷

لہ طبقات ناصری صفحہ ۱۸۵۔

باب

میں منہمک ہوگیا۔ اُدھر اس کی ماں نے حکومت کے معاملات میں دخل دینا اور محل کی دوسری خواتین کو گزشتہ رقابت کے انتقام میں ستانا شروع کیا۔ غرض چھ مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ رکن الدین کے خلاف ہر طرف شورش بپا ہوگئی اور وہ شہر سے باہر فوج لے کے گیا تو خود شہر میں اُمرائے دہلی انحراف کرنے لگے اِسے دفع کرنے کے لئے وہ دوبارہ شہر میں آیا تھا کہ لوگوں نے یورش کرکے اُسے اور اس کی ماں کو محل میں قید کردیا اور سلطانہ رضیہ کو کو بادشاہ تسلیم کرلیا جو اس آخری مخالفت میں پیش پیش تھی (ربیع الاول ۶۳۴ھ ۱۲۳۶ء)

یہ لائق شہزادی اُمور جہانداری سے بخوبی واقفیت رکھتی تھی۔ اُس کی شجاعت اور فراست میں بھی کسی کو کلام نہ تھا لیکن اسلامی ممالک میں عورتوں کی بادشاہی کو کبھی پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ دوسرے رضیہ کے کئی بھائی موجود تھے اور گو رکن الدین اور اُس کی ماں سے پیچھا چھڑانے کے لئے امرائے دہلی نے رضیہ کی بادشاہی پر اتفاق کرلیا تھا، اور جن صوبہ داروں نے سرکشی کی انھیں اول اول رضیہ نے جبراً اپنا مطیع بنالیا، بایں ہمہ یہ اُمرا پوری طرح مطمئن نہ ہوئے اور اس کے خلاف کہیں نہ کہیں شورش کی آگ بھڑکتی رہی حتیٰ کہ ۶۳۷ھ ۱۲۴۰ء میں جب کہ وہ اسی قسم کی ایک شورش فرو کرنے کی غرض سے بھٹنڈے پر فوج کشی کر رہی تھی خود اس کے ہمراہیوں نے سازش کرکے اُسے گرفتار کرلیا اور دہلی میں اس کے ایک اور بھائی سلطان معزالدین بہرام شاہ کی بادشاہی کا اعلان کردیا گیا۔ رضیہ نے قید میں بھٹنڈے کے صوبہ دار سے شادی کرکے پھر ایک مرتبہ تختِ دہلی کے لئے قسمت آزمائی کی تھی۔ مگر بہت کم لوگوں نے اس کا ساتھ دیا اور وہ اور اُس کا شوہر شکست کھاکے مارے گئے

اِسی بادشاہ بہرام شاہ کا عہد ہے جس میں مغلوں یا چنگیز خانیوں نے پہلی مرتبہ دریائے سندھ کو عبور کیا اور حکومت دہلی کو ازسرنو پنجاب کو بچانے کا فکر پیدا ہوگیا ۔

یہ خوفناک حملہ آور، جنھیں اسلامی تاریخوں میں "کفارِ مغل"، یا چنگیز خانیوں کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اِسی زمانے میں مغولستان (منگولیہ) کے پہاڑی بیابانوں سے اُٹھ کر ٹڈی دل کی طرح ایشیا کے اسلامی ممالک پر پھیل گئے تھے اور کرمان وغزنی پر مستقل قبضہ کرلینے کے بعد، اب ہندوستان کے زرخیز علاقوں پر اُن کا دانت تھا۔ شمالی وسطِ ایشیا کے وحشی اقوام کے یہ سیلاب یورپ و ایشیا کی تاریخ میں کوئی نئی بات نہ تھے۔ قرونِ ماضیہ میں

فتنۂ مغول

کوہستانِ التائی کی وادیاں ان قوموں کے فطری گہوارے تھے جہاں چند صدی میں اِن کی تعداد اس قدر بڑھ جاتی تھی کہ پھر کوئی ملک اِن کا ریلا نہ روک سکتا تھا اور وہ سیلاب بے پناہ کی طرح ممالکِ جنوبی میں اُمنڈ آتے تھے؛ قدیم تاریخ میں اِن یورشوں کا جابجا سراغ ملتا ہے لیکن تفصیلی واقعات میسّر آنے کے اعتبار سے وہ "فتنۂ مغول" یہی ہے جس کے صحیح حالات محفوظ ہیں[1]۔

واضح رہے کہ یہ وحشی قوم، ترک یا تاتاریوں کی ہم نسل تھی اور آپس کی لڑائیوں میں اکثر تاتاریوں ہی کا پلّہ بھاری رہتا تھا؛ چنانچہ بارھویں صدی عیسوی کے آخیر تک مغل قبائل کسی حد تک تاتاری بادشاہوں کے ماتحت تھے۔ لیکن اسی زمانے میں ایک مغل بادشاہ **آؤنگ خاں** (طغرل تگین) نے مغولستان کے صحرائی علاقوں میں بڑی قوت اور جمعیت بہم پہنچائی اور **تموزچی یا تموچین** بن یسوکا نامی مغل سردار نے بھی اپنے ہمسایوں سے شکست کھاکر اوّل اسی بادشاہ کی پناہ لی تھی۔ یہی تموچین وہ سردار ہے جو آخر میں **چنگیز خاں** کے مہیب لقب سے دنیا میں مشہور ہوا[2]۔

تموچین کی پہلی ترقی یہ تھی کہ آؤنگ خاں سے اُس کی لڑائی چھڑی اور اس میں کامیاب ہوکر وہ اُس کی "سلطنت" کا مالک ہوگیا۔ یہ سلطنت چند ویران و وسیع رقبوں پر مشتمل تھی جن میں صحرائی مغلوں کے خانہ بدوش قبائل اپنے اونٹ اور گھوڑے چراتے پھرتے تھے؛ تموچین نے اِن میں اتحاد و پیوستگی پیدا کی اور ایک بہت بڑی مجلس منعقد کرکے اُورس (یعنی قبائل) مغول میں اپنی بادشاہی کا اعلان کیا، اور غالباً بعض ایسی

---

[1] ساتویں صدی ہجری اور بعد کی اکثر بڑی بڑی عربی فارسی تاریخوں میں "فتنۂ مغول" کے حالات تحریر ہیں ابن اثیر نے خاص کر نہایت عمدہ اور سبق آموز پیرائے میں ان کافروں کے ہاتھ سے بلادِ اسلامی کی تباہی کے واقعات لکھے ہیں۔ لیکن ہمارے لئے سب سے اچھا ماخذ طبقات ناصری ہے جس کا مولف اِن یورشوں کے وقت خود بھی بعض لڑائیوں میں شریک تھا اور اسے معلومات کے دیگر مستند ذرائع بھی میسر تھے۔ چنانچہ اس کی تاریخ کا آخری حصہ (طبقہ ۲۳) "فتنۂ مغول" کے متعلق نہایت معتبر سمجھا جاتا ہے۔ ۱۲

[2] بعض تاریخوں میں اسے تموچین یا تموجین اور چنگیز کی بجائے جنغیز بھی لکھا ہے۔ ۱۲

تدابیر بھی اختیار کیں جن سے یہ اوہام پرست وحشی اس کو خدا کا خاص فرستادہ یا اوتار سمجھنے لگے۔

شمالی چین کی فتح اور ترکستان کے تاتاری بادشاہ کو مغلوب کرنے کے بعد تموچین کو، جو اب چنگیز یا چینگیز خاں، یعنی "بڑا سردار" ہو گیا تھا، اسلامی ممالک میں سب سے پہلے خوارزم (خیوا) کے بادشاہ سے سابقہ پڑا جس کی حدود سلطنت ترکستان کے علاقے تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اُن دنوں (۶۱۴ھ ۱۲۱۸ء میں) یہاں سلطان محمد خوارزم شاہ، جو خود بھی ترک نژاد تھا، فرماں روائی کرتا تھا اور مشہور ہے کہ اُسی کے اشارے سے مغلوں کے سفیر اور مغل سوداگروں کے قافلے کو جس میں چین و ترکستان کی بیش قیمت اشیا تھیں سلطان کے ایک عہدہ دار نے لُوٹ لیا اور تمام مغل سوداگر و سفیر اس کے ہاتھ سے مارے گئے۔ ایک شخص البتہ بچ کر نکل گیا تھا جس نے چنگیز خاں کو اس واقعے کی اطلاع دی اور اس نے شاہ خوارزم سے انتقام لینے کی تیاریاں کیں۔

بروئے درایت یہ قصہ کسی قدر مشتبہ نظر آتا ہے۔ گمان غالب یہ ہے کہ چنگیز خاں اس راز کو خوب سمجھتا تھا کہ اگر ایک پراگندہ قوم کو متحد کرنا ہو تو کسی غیر سلطنت سے جنگ چھیڑ دی جائے اور عجب نہیں کہ اس موقع پر مغلوں کے جنگی جوش کو جذبۂ انتقام سے بڑھ کر شوق غارت گری نے تقویت پہنچائی ہو۔ بہرحال مغولستان کے کے ہر گوشے میں چنگیزی قاصد دوڑ گئے اور تھوڑے ہی عرصے میں پائے تخت قراقرم کے میدانوں میں ۲ سو علم لہراتے نظر آئے اور فی علم ایک ہزار کے حساب سے، ۲ لاکھ جنگجو سواروں کا لشکر جمع ہو گیا[1]۔ کوچ کے وقت دس دس سواروں کی ٹولی بنادی گئی تھی اور ہر ٹولی کے پاس کھانا پکانے اور پانی پینے کے لئے ایک دیگچہ اور مشک تھی اور چونکہ تین مہینے تک ایسے ملک کا سفر درپیش تھا جہاں رسد ملنے کی امید نہ تھی، لہذا گھوڑوں کے بہت سے گلے فوج کے ساتھ تھے کہ جب کچھ نہ ملے تو اُن کے گوشت اور گھوڑی کے دودھ سے شکم پُری کی جائے۔

غرض ۶۱۶ھ ۱۲۲۰ء میں یہ ٹڈی دل، شاہ خوارزم کی فوجوں کو شکستیں دیتا ہوا،

---

[1] طبقاتِ ناصری مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی میں آٹھ سو علم اور تین لاکھ گھوڑے (۹) لکھے ہیں مگر یہ غلطی ہے۔ (دیکھو راورٹی صفحہ ۹۶۸)

باب ۲

سمرقند و بخارا کے علاقوں میں پھیل گیا۔ راستے میں جو شہر و قریہ ملا وہاں کے زن و مرد تقریباً ہر متنفس کو مغلوں نے بے دریغ قتل کیا اور بستیوں میں آگ لگا کر آبادی کا نام و نشان مٹا دیا۔ یہی گت خود اِن شہروں کی ہوئی جو علم و ہنر کے اعتبار سے اُن دنوں متمدن دنیا کے سب سے بڑے مرکز شمار ہوتے تھے۔ بہت کم نفوس ایسے تھے جو مغلوں کی بہیمیت کا شکار ہونے سے بچے اور جو مارے نہیں گئے اُن کے ساتھ ایسی بے رحمی اور بے آبروئی کا سلوک کیا گیا کہ اِس ذلت و تکلیف کے مقابلے میں، موت راحت نظر آتی تھی؛ اُترار، تاشقند خجند، نور اور بلخ سب پر کم و بیش یہی گزری اور اس خوفناک تاراجی سے نہ وہ شہر محفوظ رہے جنھوں نے مغلوں کا مقابلہ کیا تھا، اور نہ وہ جنھوں نے رحم و کرم کی امید پر مصالحت کر لی تھی؛ سمرقند فتح کرنے کے بعد چنگیز نے اپنی فوج کا ایک حصہ تو سلطان خوارزم شاہ کے تعاقب میں بحر خزر کی جانب روانہ کیا اور ایک فوج اس کے چھوٹے بیٹے تولی خان کی سرکردگی میں مرو و خراسان کے علاقوں میں گھس گئی؛ خوارزم شاہ شکستیں کھاتا ہوا، استر آباد تک ہٹ آیا تھا وہیں سفر کی تکان اور اِن مصائب کے رنج میں اُس نے وفات پائی (۶۱۷ھ ۱۲۲۰ء) مگر مغلوں کی وہ فوج جو اس کے تعاقب میں آئی تھی شوق غارت گری میں آذربیجان و قفقازیہ تک بڑھی اور یہاں سے سلطنت روس کے یورپی علاقے پامال کرتی ہوئی سائبیریا کے راستے پھر مغولستان پہنچ گئی؛ مرو و خراسان کے شاداب خطوں کو بے رحم تولی خاں نے غارت کیا اور شہر ہرات کو فتح کر کے بدخشاں میں اپنے باپ سے جا ملا جو خوارزم شاہ کے جانشین سلطان جلال الدین سے لڑنے کے لیے غزنی کی طرف بڑھ رہا تھا؛

چنگیزی لشکر ہند میں۔

جلال الدین اپنے باپ کا سب سے بڑا اور لائق بیٹا تھا لیکن اس عرصے میں کہ وہ اپنے باپ کا تابوت لے کر وطن آئے، پایۂ تخت خوارزم میں چند اُمرا نے اس کے چھوٹے بھائی کو تخت پر بٹھا دیا۔ اور گو ایک فریق جلال الدین کا طرف دار تھا لیکن اس نازک وقت میں کہ چنگیز خانی وحشیوں نے تہلکہ مچا رکھا تھا، اس نے اپنے حق کے واسطے بھائی سے لڑنا پسند نہ کیا اور خاموشی سے جاں نثاروں کا ایک گروہ ساتھ لے کر مغلوں سے بچتا ہوا غزنی آ گیا (ذی الحجہ ۶۱۷ھ ۱۲۲۱ء) جہاں چند سال پہلے خوارزمیوں نے تاج الدین یلدوز کو نکال کر اپنا قبضہ جما لیا تھا (صفحہ ۱۸۱)

غزنی میں بہت سے تُرک سردار جنھیں مغلوں کی یورشوں نے ہر طرف منتشر کر رکھا تھا، اس کے زیرِ علم جمع ہو گئے اور اول اول مغلوں کی جو فوجیں اس طرف بڑھیں انھیں جلال الدین نے شکست دی لیکن ۶۱۸ھ/۱۲۲۱ء کے شروع میں جب خود چنگیز خاں اپنے پورے لشکر کو لے کر بڑھا تو جلال الدین اس ٹڈی دل کا مقابلہ نہ کر سکا اور غزنی چھوڑ کر ہندوستان کی طرف ہٹ گیا۔ وہ غالباً سلطنت غزنی کی قدیم حدود کی بنا پر پنجاب کی ملکیت کا مدعی تھا اور اسی علاقے میں پہنچ کر از سرِ نو جنگی تیاریاں کرنی چاہتا تھا۔ مگر ابھی دریائے سندھ کو اُس نے عبور نہیں کیا تھا کہ ناگہاں چنگیز خانی لشکر نے بڑھ کر اُسے تین طرف سے گھیر لیا اور دریا کے مغربی کنارے پر وہ خوں ریز لڑائی ہوئی جو شاید اقوامِ دنیا میں صرف تُرک ہی لڑ سکتے ہیں۔ سلطان کے رفیقوں کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہ تھی اور مقابلہ کئی لاکھ تیغ زنوں کے لشکر سے تھا جو آج تک کسی غنیم سے مغلوب نہ ہوا تھا۔ جلال الدین اس مقابلے سے بچتا ہوا خوارزم سے غزنی اور غزنی سے ہندوستان آیا تھا لیکن دشمن کے سامنے پہنچ جانے کے بعد اس کی غیرت نے بغیر لڑے میدان سے نکل جانا گوارا نہ کیا جس کا ابھی تک موقع موجود تھا۔ غرض صبح ہوتے ہی مغلوں کی فوج نے حرکت کی اور دوپہر تک سلطانی رفقا فوق العادت شجاعت سے لڑتے اور کٹ کٹ کے گرتے رہے۔ حتیٰ کہ میمنہ اور میسرہ منتشر ہو گئے اور ان کا کوئی سپاہی زندہ نہ رہا۔ لیکن قلبِ سپاہ کی پیوستگی میں، جسے خود سلطان لڑا رہا تھا، مطلق فرق نہ آیا۔ یہ پوری صف جس میں غالباً دو ہزار سے زیادہ آدمی نہ تھے، اُسی طرح قدم جمائے ہوئے لڑتی رہی اور مغلوں کا سخت سے سخت حملہ بھی اس میں بے ترتیبی نہ پیدا کر سکا۔ حملہ آور سمندر کی موجوں کی طرح ہر طرف سے بڑھے چلے آتے تھے اور اُن کی پیہم یورش نے آدھے سے زیادہ سپاہیوں کو مار گرا دیا تھا۔ لیکن سلطان جلال الدین کے متعلق چنگیز کا حکم تھا کہ اُسے زندہ گرفتار کیا جائے اور اب، جب کہ سلطان کے ساتھیوں کی کل تعداد صرف سات سو رہ گئی تھی، اِس حکم کی تعمیل میں چند ساعت کی محض تاخیر نظر آتی تھی۔ ادھر جلال الدین کا ماموں زاد بھائی اُسے لپٹ گیا کہ جس طرح ہو سکے اب بھی اس لڑائی سے ہٹ کر نکل جائے، جس کا انجام، آغاز ہی کے وقت معلوم ہو چکا تھا۔ سلطان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے جنگی گھوڑے سے اُتر کر وہ اسپِ خاصہ پر سوار ہوا۔ اہل و عیال کو

باب

الوداع کہی۔ ایک آخری حملہ کر کے مغلوں کو تھوڑی دور تک ہٹا دیا اور پھر رُخ بدل کر گھوڑے کو دوڑاتا ہوا دریا کی طرف لے گیا اور کنارے پر ایک چابک ایسا مارا کہ گھوڑا تڑپ کر دریا میں کود پڑا!

دریا کا کنارہ اُس مقام پر آٹھ دس گز کے قریب بلند تھا۔ اتنی بلندی سے سندھ جیسے تیز و عمیق دریا میں گھوڑا کُدا دینا ایسا ہوش رُبا کام تھا کہ دوست دشمن سب کے مُنہ سے واہ نکل گئی۔ چنگیز خاں اور اُس کے مغل جنگ آزما حیرت سے تکتے ہی رہے اور جلال الدین گھوڑا تیرا کر دوسرے کنارے پر پہنچ گیا[1]۔

جلال الدین کی مراجعت

دریائے سندھ کے اس طرف ابھی تک ناصر الدین قباچہ والی سندھ کی عملداری تھی یا بعض پہاڑی علاقوں میں کھوکھروں کے آزاد قبائل آباد تھے۔ کچھ عرصے تک جلال الدین کا اسی دوآبے میں، جسے "سندھ ساگر" کہتے ہیں، قیام رہا۔ اس کے جاں نثار تُرک جو مغلوں کے ہاتھ سے زندہ بچ گئے تھے، یہیں آکر اس کے شریک حال ہو گئے اور یہیں سے اُس نے سلطان شمس الدین سے پنجاب کے متعلق وہ خط کتابت کی جس کا مجمل حال پہلے ہماری نظر سے گزر چکا ہے (صفحہ ۱۸۲)۔ شمس الدین، سلطان جلال الدین کو دہلی میں اپنا مہمان بنانے پر آمادہ تھا لیکن یہ بات اُسے گوارا نہ ہوئی کہ ایسے غیر معمولی عزم و ہمت کے بادشاہ کو اپنے سر پر آزادانہ تسلط حاصل کرنے کی اجازت دے دیتا۔ اور اُس وقت جلال الدین میں اتنی قوت نہ تھی کہ جبراً پنجاب کو چھین لیتا۔ بے شبہ اس شکستہ حالی میں بھی اس کا حوصلہ پست نہیں ہوا تھا اور وہ کھوکھروں کو اپنے ساتھ ملا کر ایک نئی فوج مرتب کر رہا تھا۔ لیکن ایک تو حکومت دہلی نے اس کی کوئی اعانت نہ کی، دوسرے قباچہ سے اس کی لڑائی چھڑ گئی اور ان سب پر طرّہ یہ ہوا کہ چنگیز خاں نے یکے بعد دیگرے دو فوجیں روانہ کیں کہ ایسے خطرناک حریف کو دم لینے کی مہلت نہ ملے۔ ان فوجوں کے

[1] طبقات ناصری نے اِن واقعات کو اجمالی طور پر لکھا ہے (طبقہ شانزدہم) لیکن اس لڑائی کے تفصیلی حالات کے لئے سب سے اچھے ماخذ چنگیز خانیوں کے مداح علاؤ الدین جوینی کی مشہور تاریخ جہاں کشا ہے جامع التواریخ بھی مغل بادشاہوں کے دربار میں لکھی گئی اور نہایت مستند تاریخ سمجھی جاتی ہے۔ نیز دیکھو راورٹی حواشی صفحات ۲۸۶ وغیرہ۔ الیٹ جلد دوم صفحہ ۵۵۰ وغیرہ۔

سامنے سے جلال الدین کو ہٹ کر جنوبی سندھ کی راہ لینی پڑی اور ملتان و اُچھ سے گزر کر وہ سندوستان پہنچا جسے آج کل سیہوان کہتے ہیں۔ پھر یہاں سے دیبل تک تمام قلعے فتح کر کے وہ ایک مستقل حکومت قائم کرنے کی تدبیر کر رہا تھا کہ عراق عرب سے ترک اُمرا نے بلانا شروع کیا اور ادھر چنگیز مشرقی ممالک سے واپس مغولستان چلا گیا لہذا سلطان جلال الدین بھی دوبارہ مغلوں سے شمشیر آزمائی کرنے کے لئے صحرائے مکران کے راستے ایران آگیا اور یہیں عراق و آذربیجان میں ایک عرصے تک اپنی شجاعت کے جوہر دکھا کر اس نے جان دی؎۱ (۶۲۸ھ / ۱۲۳۱ء)

مغلوں کا حملہ ہند پر

مگر جلال الدین کی وجہ سے مغلوں نے ہندوستان کا جو راستہ دیکھ لیا تھا اُسے وہ پھر کبھی نہ بھولے۔ خود چنگیز خاں اول اول ہندوستان کے راستے چین جانے کا تہیہ کر رہا تھا اور اُس کی غیر معمولی ہمت کے آگے فاصلے کی درازی کوئی قابل لحاظ شے نہ تھی۔ لیکن اسی اثنا میں خبر ملی کہ ترکستان و خطا کے بعض رئیسوں نے سرکشی پر کمر باندھی ہے اور مغلوں کی اطاعت سے منحرف ہو گئے یا ہونا چاہتے ہیں۔ پس چنگیز خاں کو مغرب کی طرف مراجعت کرنی پڑی اور ہندوستان سے گزرنے کی (یعنی اس شاداب ملک کو تباہ و تاراج کرنے کی) آرزو اس کے دل میں تھی بھی تو پوری نہ ہو سکی اور وہ مغولستان پہنچ کر چار سال کے اندر فوت ہو گیا؎۲ (رمضان ۶۲۴ھ / ۱۲۲۷ء)

؎۱ ایک روایت جسے راورٹی بھی صحیح تسلیم کرتا ہے یہ ہے کہ آخر میں اس کا دل دنیا سے سرد ہو گیا اور اس نے درویشانہ لباس پہن کر بہت دن تک گمنامی میں زندگی بسر کی۔ (راورٹی۔ حاشیہ صفحہ ۲۹۹)

؎۲ صاحب طبقات ناصری نے اس خونخوار فاتح کی صورت و سیرت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

"ثقہ لوگوں کا بیان ہے کہ جس وقت چنگیز خاں خراسان آیا، اس کی عمر پینسٹھ* سال کی تھی۔ وہ نہایت تنومند، طاقتور اور دراز قامت آدمی تھا۔ چھدری ڈاڑھی کے بال سفید ہو گئے تھے اور بلی کی سی (کنجی) آنکھیں تھیں۔

"وہ در نہایت جلادت و زیرکی و عقل و دانائی و ہیبت و قتال، عادل و ضابطہ و خصم شکن و دلیر

باب۱ اب چنگیز خاں کی وصیت کے مطابق اس کا تیسرا بیٹا **اُگتائی خاں** وارثِ ملک ہوا جسے "قآن" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ یہ شخص اپنے باپ یا بھائی (چغتائی) کی طرح مسلمانوں کا دشمن نہ تھا اور اُس کے عہد میں اسلامی ملکوں میں ازسرِ نو آبادی اور سرسبزی کے آثار نظر آنے لگے۔ لیکن افغانستان پر مغلوں کا پورا تسلط ہونے کے بعد سندھ و پنجاب اُن کی زد میں آگئے تھے۔ سلطنتِ دہلی سے لڑائی چھیڑنے کے بھی بہت سے حیلے مل سکتے تھے کیونکہ شمس الدین کے زمانے سے یہ سلطنت خراسان وسیستان مکران و غزنی کے ان امیرزادوں کا مامن بن گئی تھی جو کسی طرح چنگیز خانی سیلاب سے بچ کر فرار ہو گئے تھے۔ دوسرے عجب نہیں کہ سلطان شمس الدین کی وفات کے بعد* اُمرائے ہند کی نااتفاقی نے بھی، مغلوں کو جو پہلے سے موقع کی تاک میں تھے، ہندوستان پر حملہ کرنے کی جُرأت دلائی ہو۔ بہرکیف ۶۳۹ھ/۱۲۴۱ء میں غور و ہرات کے مغل سرداروں نے ایک بڑی فوج مرتب کی اور طائر نامی سپہ سالار کے ماتحت دریائے سندھ کو عبور کیا۔ اِن علاقوں میں سلطنت دہلی کے (ملتان و لاہور) دو صوبے تھے اور اگر یہاں کے صوبہ دار (مقطع) مل کر مدافعت کرتے تو مغلوں کو روک لینا یا کم سے کم اتنے عرصے تک اُلجھائے رکھنا محال نہ تھا کہ جنوبی اقطاع سے کمک پہنچ جائے جس کا قطب الدین کے زمانے سے بہت عمدہ انتظام کر دیا گیا تھا لیکن عہد رکن الدین و رضیہ میں جو اختلافات امرائے سلطنت کے درمیان پیدا ہو گئے تھے معز الدین بہرام بھی انھیں دور نہ کرسکا تھا۔ ادھر بعض دیگر اسباب ایسے پیش آگئے کہ وہ وقت پر شہر لاہور کو تباہی سے نہ بچا سکا۔

لاہور کی تباہی واضح رہے کہ حملہ آوروں نے سب سے پہلے ملتان کا رُخ کیا تھا جو سرحد کا سب سے بڑا جنگی مرکز اور آباد شہر تھا۔ مگر یہ سُن کر کہ **کبیر خان ایاز** والئ ملتان

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ و خونریز و خونخوار۔ و ایں معنی برہمہ عالمیاں ظاہر است کہ او را چندیں معنی عجیب بود است اول آنکہ مکر و استدراجے (یعنی شعبدہ بازی) دانست۔ گویند بعضے از شیاطین با او یار بودند....."

(طبقات۔ صفحہ ۳۰۲۔ * کلکتے کے مطبوعہ نسخے میں عمر پچپن سال لکھی ہے مگر یہ صریحاً غلط ہے۔ نیز دیکھو راورٹی۔ صفحہ ۱۰۷۷)

باب۲

مقابلے کے لئے پوری تیاری کر چکا ہے انھوں نے ملتان آتے آتے شمال کی جانب گھوڑے موڑ دئے اور یکا یک لاہور پہنچ گئے۔ کبیر خاں نے جو بہت دن سے حکومت دہلی سے ناراض تھا، اپنی جنگی تیاری کے دوران میں سندھ کی خود مختاری کا بھی اعلان کر دیا تھا اور بے شبہہ اہلِ سندھ کو وطن کی مدافعت کا جوش دلانے کے لئے اس کا یہ فعل مصلحت اور ذاتی فائدے سے خالی نہ تھا۔ لیکن چونکہ مرکزی سلطنت سے علٰحدہ ہونا اُس خود مختاری کا مدعا تھا لہٰذا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حملہ آوروں کے واسطے لاہور کا راستہ کھل گیا اور سلطنت ہند سے مغلوں کی پہلی لڑائی جہلم کی بجائے راوی کے کناروں پر واقع ہوئی۔

اُن دنوں لاہور نہایت بارونق تجارتی شہر تھا لیکن یلدز و قباچہ کی شکست اور الحاقِ سندھ کے بعد اس کی جنگی اہمیت کم ہوگئی تھی اور مغلوں کے اچانک حملے کے وقت قلعے میں جنگی اسلحہ اور سازو سامان اس قدر کافی نہ تھا کہ حملہ آوروں کا جم کر مقابلہ کیا جا سکے۔ سب سے بڑی خرابی یہ ہوئی کہ شہر کے بہت سے ذی اثر باشندوں نے مدافعت کرنے سے انکار کیا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں کے اکثر سوداگروں کو چین کے تجارتی قافلے وسط ایشیا کے ممالک تک آتے جاتے رہتے تھے، چنگیز خانی عہدہ داروں سے تجارت کرنے کی اجازت لینی پڑتی تھی (کیونکہ اب وسطِ ایشیا کے بہت سے ملکوں میں انھیں مغلوں کا حکم جاری تھا) اور اسی سلسلے میں انھیں مغل حکام سے وہ تحریری سندیں مل گئی تھیں جن میں حفظِ جان و مال کا وعدہ درج ہوتا تھا۔ اس قسم کی تحریریں مغل اصطلاح میں "پائزہ" کہلاتی تھیں[1]

یہ رنگ دیکھ کر چند روز ہی کی لڑائی میں لاہور کے صوبہ دار ملک قراقش کو شہر کی مدافعت سے نا امیدی ہوگئی۔ دہلی ایک طرف بھٹنڈے یا سامانہ کی جنگی چھاؤنیوں سے بھی کوئی فوجی مدد وقت پر نہ پہنچ سکی اور ادھر حملہ آوروں کی منجنیقوں نے پیہم سنگ باری سے فصیلوں میں رخنے ڈال دئے۔ تیر اندازی کی طرح اس فن میں بھی مغلوں کو کمال حاصل تھا۔ اور یہ پڑھ کر کہ چنگیز خاں کے لشکر میں دس ہزار سپاہی خاص منجنیق چلانے پر مقرر تھے[1] اندازہ ہو سکتا ہے کہ مغلوں میں قلعہ شکن توپ کی اس پیش رو (یعنی منجنیق) کو کتنی اہمیت دی جاتی تھی۔

[1] طبقات ناصری صفحہ ۳۵۶۔

باب

آخر ایک رات قراقش اپنے ملازمین کے ساتھ شہر سے باہر آیا اور جس طرح ممکن ہوا لڑ بھڑ کر نکل گیا۔ اُس کی جرات قابلِ تعریف تھی لیکن اس واقعے نے ادھر تو محصورین کو اور بھی شکستہ دل کر دیا اور اُدھر محاصرین کے حملوں میں زیادہ شدت آگئی اور اب وہ فصیل کے رخنوں میں سے حملہ کر کے شہر کے اندر تک آنے لگے۔ اس نازک موقع پر اسلامی فوج کے دو گروہوں نے مدافعت کا بیڑا اٹھایا اور کوتوال شہر (آق سنقر) اور امیر آخور* (دین دار محمد) کی ماتحتی میں اس وقت تک کہ اِن میں کا ایک متنفس بھی زندہ رہا، برابر لڑتے رہے "تا آنگاہ کہ ہر دو طائفہ بعد از جہاد بسیار بدولت شہادت رسیدند"[1]۔

فتح لاہور کے نتائج۔

اُن کی جانبازی رائگاں نہ گئی۔ طبقات ناصری کی روایت کے بموجب مغلوں کے تیس چالیس ہزار سپاہی مارے گئے اور ایسا تو شاید کوئی بھی نہ تھا جو بالکل زخمی نہ ہوا ہو پھر یہ کہ گو انھوں نے شہر میں گھس کر نہ سوداگروں کے پایزوں کی پروا کی نہ عورتوں اور بچوں کی آہ و زاری کی بلکہ قتل عام کر دیا اور جو چند نفوس زندہ بچے انھیں قید کر کے اپنے ساتھ لے گئے باایں ہمہ لاہور پر ان کا مستقل قبضہ نہ ہو سکا اور غالباً مذکورۂ بالا نقصانات ہی کی وجہ سے وہ یہاں زیادہ نہ ٹھیرے بلکہ شہر کو تباہ و تاراج کرنے کے بعد بہت جلد واپس غزنی چلے گئے۔

شاید اس واپسی کی ایک وجہ یہ ہو کہ اُسی زمانے میں اُکتائی خاں نے وفات پائی (۶۳۹ھ ۱۲۴۲ء) لیکن اصل سبب یقیناً یہی ہوگا کہ اُن کی تعداد کم رہ گئی تھی اور پائے تخت دہلی سے ایک بڑی فوج پنجاب کی طرف کوچ کر رہی تھی۔ غرض ہندوستان پر اس پہلی یورش میں یہ خوفناک حملہ آور لاہور سے آگے نہ بڑھ سکے، باایں ہمہ اُن کے اسی ایک حملے نے تمام شمالی ہند کو چونکا دیا[2] اور سلاطین دہلی کے منصوبۂ کشور کشائی پر اتنا اثر ڈالا کہ آئندہ

---

* امیر یا میر آخور یعنی داروغۂ اصطبل، جو اس زمانے میں فوج کے بڑے عہدہ داروں میں شامل ہوتا تھا۔

[1] طبقات ناصری میں لاہور کے اس محاصرے اور تسخیر کا حال الگ الگ تین جگہ لکھا ہے مگر زیادہ تفصیل طبقۂ آخری میں درج ہے (صفحہ ۳۹۳ و ۳۹۴)۔

[2] لاہور کی تاراجی کی خبر نے دہلی میں کہرام ڈال دیا تھا۔ اور نہ صرف تاریخوں سے بلکہ اُس زمانے کی دیگر تصانیف سے بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مغل حملہ آوروں کی کس درجہ ہیبت اہل ہند

نصف صدی تک انھیں اپنی حدود حکومت کو (جنوب میں) زبدا کے آگے بڑھانے کی جرأت یا فرصت نہ ہوئی اور تمام براعظم ہندوستان کا ایک مرکزی حکومت کے ماتحت سیاسی اتحاد بہت دن کے لئے ملتوی ہوگیا۔ چنانچہ بلبن جیسے بلند حوصلہ اور اقبال مند بادشاہ نے بھی اِنھیں "مغول" سے شمالی ہند کو بچانے کی خاطر مزید فتوحات کا ارادہ ترک کر دیا تھا جس کا حال کسی قدر وضاحت سے آگے آتا ہے۔

تسخیر لاہور کا ایک اور اہم نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں کو پنجاب کی ملکیت کا دعویٰ پیدا ہوگیا اور وہ بار بار اِس ملک پر حملے کرتے رہے۔ اِن میں سے اکثر حملے محض معمولی تاخت تھے اور لوٹ مار کے سوا اُن کا اور کوئی مدعا نہ ہوتا تھا۔ لیکن تین چار مرتبہ اُنھوں نے زیادہ وسیع پیمانے پر بھی فوج کشی کی جس کا ذکر اپنی اپنی جگہ پر آئندہ ہماری نظر سے گزرے گا۔ اِن بڑے حملوں کا بھی بظاہر کوئی دیرپا سیاسی نتیجہ نہیں نکلا اور ادھر اسلام قبول کرنے کی بدولت مغلوں کی اندرونی حالت میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا ہوگیا۔ بایں ہمہ وہ پنجاب پر برابر اپنا حقِ بادشاہی جتاتے رہے اور امیر تیمور کے حملے نے اس حق کی وہ تجدید و توثیق کی کہ بابر بادشاہ نے بھی اسی قدیم دعوے کو اپنے حملے کا حیلہ بنایا اور آخر کار ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھ دی۔ گویا ساتویں صدی ہجری میں طائرِ مغل کو جو آرزو لاہور لائی تھی وہ دسویں صدی ہجری میں پوری ہوگئی!

تیسری فصل ۔ خاندانِ شمسیہ کے آخری بادشاہ

اندرونی انقلابات

اس موقع پر مغلوں کا ٹل جانا بہت ہی غنیمت ہوا ورنہ سلطنت دہلی کو ابھی تک اپنے اندرونی تنازعوں سے نجات نہیں ملی تھی۔ بہرام شاہ سے بھی امرائے سلطنت کچھ زیادہ خوش نہ تھے اور خود اس کا چالاک وزیر خواجہ مہذب الدین دشمن ہوگیا تھا۔ بے شبہہ مغلوں کی یورش اور لاہور کی تباہی کی اطلاع نے شہر میں ایسا انتشار پیدا کیا کہ تھوڑی دیر کے لئے لوگ اپنے اختلافات بھول گئے اور قصرِ سفید میں ایک عام جلسہ منعقد ہوا جس میں

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ کے دل میں پیدا ہوگئی تھی۔

باب

مولانا منہاج الدین (صاحبِ طبقات ناصری) نے نہایت معرکہ آرا تقریر کی۔ جوش کے عالم میں لوگوں نے از سر نو بادشاہ کی اطاعت کا حلف اٹھایا اور مغلوں کے مقابلے کے لئے بہت جلد ایک بڑا لشکر فراہم ہوگیا[1] لیکن یہ فوج ابھی دریائے بیاس تک پہنچی تھی کہ ادھر تو حملہ آور لاہور سے واپس چلے گئے اور ادھر ایک شخص کے کہنے میں آکر بادشاہ نے دہلی کے کسی مشہور فاضل قاضی شمس الدین کو قتل کرا دیا جس سے شہر میں سخت برہمی پیدا ہوگئی۔ مہذب الدین پہلے سے موقع کی تاک میں تھا۔ اُس نے سردارانِ لشکر کو بادشاہ کی طرف سے بدگمان کر دیا اور یہ بدگمانی اس قدر بڑھی کہ اُسی لشکر نے جو ماہ جمادی الآخر میں مغلوں سے لڑنے کے لئے روانہ ہوا تھا ماہ شعبان میں واپس دہلی آکر شاہی قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ مصالحت اور صفائی کر لینے کی ابھی تک گنجایش تھی لیکن احمق مشیروں نے بادشاہ کو راہ راست پر نہ آنے دیا اور آخر کار وہ قید ہو کر غالباً قتل کر دیا گیا۔ (ذی قعدہ ۶۳۹ھ ۱۲۴۱ء)

سلطان علاء الدین مسعود بن رکن الدین فیروز

اہل شورش میں ملک بلبن کشلو خاں[2] بھی پیش پیش تھا۔ اور بہرام شاہ کی معزولی کے ساتھ اول اول اسی کی بادشاہی کا اعلان ہوگیا تھا لیکن باقی تین بڑے بڑے سرداروں نے شمس الدین کے مقبرے میں جمع ہو کر فیصلہ کیا کہ جہاں تک ممکن ہو بادشاہی اسی مرحوم سلطان کی اولاد میں رہنی چاہیئے اور گو اس کے دو بیٹے بھی موجود تھے لیکن قانون وراثت کے اعتبار سے انھوں نے **علاء الدین مسعود** کا انتخاب کرلیا جو سلطان رکن الدین بن ایلتمش کا بیٹا تھا۔ کشلو خاں نے کثرتِ رائے کے سامنے سر جھکا دیا اور سلطان مسعود کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ شاید اسی نیک نفسی اور اطاعت گزاری کے صلے میں نئے بادشاہ نے بھی دیگر اُمرا میں سب سے زیادہ اُس کا اعزاز و اکرام کیا

---

[1] طبقات ناصری صفحہ ۱۹۵۔ واضح رہے کہ صاحبِ طبقات ہندوستان آنے سے پہلے خراسان و ہرات کے علاقوں میں چنگیز خانیوں کی ابتدائی یورشوں کے وقت موجود اور بعض لڑائیوں میں بھی شریک رہ چکا تھا لہٰذا اس جلسے میں اُسی کو تقریر کرنے کے لئے منتخب کیا گیا۔

[2] بعض فارسی تاریخ نویسوں نے اس بلبن اور غیاث الدین بلبن (الملقب بہ "الغ خاں") میں کوئی امتیاز نہیں کیا جس سے طرح طرح کی غلط فہمی پیدا ہوتی ہے حالانکہ یہ دو بالکل علٰحدہ شخص ہیں اور پہلے کا پورا نام ملک عز الدین بلبن کشلو خاں تھا۔

باب ۱

اور اجمیر و مانڈور و ناگور کے اقطاع عنایت کئے[۱]۔

مغلوں کا دوسرا حملہ

مسعود بھی اپنے باپ اور چچا کی طرح بادشاہی کے اہم فرائض بجالانے کی قابلیت نہ رکھتا تھا لیکن ابتدا میں اُس نے کوئی حرکت ایسی نہ کی کہ لوگوں کو شکایت کا موقع ملتا۔ دوسرے سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں پر جن اُمرا کا انتخاب ہوا وہ نہایت مستعد اور بیدار مغز مدبّر تھے اور اُن کی نگرانی میں نہ صرف حکومت کی کل ٹھیک ٹھیک چلتی رہی بلکہ فوج کی ازسرنو تنظیم عمل میں آئی اور سلطنت کے نئے "حاجب" غیاث الدین اُلغ خاں نے پہلی مرتبہ وہ لشکر جرار مرتب کیا جس کی مستعدی اور قواعد دانی کچھ عرصے بعد دُور دُور کے ملکوں میں مشہور ہوگئی تھی۔

مگر پہلی دفعہ جب یہ فوج مغلوں سے لڑنے کے لئے اُچھ کی طرف بڑھی تو کسی لڑائی کی نوبت نہیں آئی اور حملہ آور ڈر کے پسپا ہوگئے (۶۴۳ھ / ۱۲۴۵ء) مغلوں کا ہندوستان پر یہ دوسرا حملہ تھا اور اس مرتبہ وہ سیستان سے آئے اور افغانستان کے جنوب سے نکل کر سیدھے سندھ میں داخل ہوگئے تھے۔ کبیر خاں ایاز کی وفات (۶۳۹ھ / ۱۲۴۱ء) کے بعد یہاں سلطنت دہلی کی طرف سے جو صوبہ دار مقرر کئے گئے تھے اُن میں اُچھ کا حاکم ہندو خان اس حملے کے وقت اپنے مستقر پر موجود نہ تھا لہٰذا شہر کی مدافعت اُس کے نائب محمد صالح کوتوال کو کرنی پڑی جس نے کمال جواں مردی سے کئی ہفتے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا یہاں تک کہ پائے تخت دہلی کی فوج قریب آپہنچی اور اُس نے شمال کی طرف سے بڑھ کر چاہا کہ خود محاصرین کو گھیر لے۔ لیکن مغل سپہ سالار منگوتہ چنگیز خاں کے خاص رفیقوں میں تھا۔ وہ اس جال میں نہ آیا اور بروقت اپنی فوج کو ہٹا لے گیا۔

سلطان ناصرالدین محمود

مگر یہ کامیابی بادشاہ کے حق میں نہایت نامبارک ثابت ہوئی۔ اُچھ کا محاصرہ اٹھانے کے لئے جو لشکر بھیجا گیا تھا خود وہ اس کے ساتھ آیا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے یہ سپاہیانہ زندگی اُسے راس نہ آئی اور صعوبات سفر کی تلافی اُس نے عیش و عشرت کے ایسے مشاغل سے کرنی چاہی جو اکثر انسان کی عقل و اخلاق کو بگاڑ دیتے ہیں۔ عیاش بادشاہ عام طور پر بدمزاج، شکی اور ظالم ہو جایا کرتے ہیں مسعود نے بھی بعض فرومایہ مصاحبوں کی

[۱] طبقات - ۲۶۹ وغیرہ۔

یشہ سے احمقانہ حرکات شروع کیں اور مورخ کے الفاظ میں "امرا کو (بلاوجہ) گرفتار یا قتل کرنا اُس کی عادت میں داخل ہوگیا اور اس کی تمام طبعی خوبیاں بدل گئیں بیہودہ مشاغل اور شکار کی طرف اس درجہ میلان ہوا کہ ملکی کاروبار میں ابتری اور سلطنت میں خرابی پیدا ہونے لگی"، یہاں تک کہ امیروں نے بالاتفاق اُسے معزول و محبوس کرکے، خاندان شمسی کے ایک اور شہزادے ملک ناصر الدین کو بادشاہی کے لئے منتخب کرلیا۔ (۶۴۴ھ ۱۲۴۵ء) باب

شاہان دہلی کے اس پیہم عزل و نصب کو دیکھ کر قدرتی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ابھی تک بادشاہ کا انتخاب اُمرائے سلطنت کے اختیار میں تھا اور گو ان اُمرا کے باہمی اختلاف رائے سے بعض اوقات خانہ جنگی کی نوبت پہنچ جاتی تھی، بایں ہمہ کوئی نالائق شخص، محض اس بنا پر کہ وہ سابق بادشاہ کا بیٹا یا بھائی ہے زیادہ عرصے تک بادشاہ نہیں رہ سکتا تھا لہٰذا اس حکومت کو ایک طور سے "موروثی بادشاہی" کہنا کافی نہیں ہوگا۔ ہندوستان میں جن لوگوں نے اسلامی سلطنت قائم کی وہ نسلاً ترک اور شاہان غزنوی کے ہم قوم تھے، اور اس کتاب کے دوسرے باب میں سلطنت غزنی کے طرز حکومت پر اسی خیال سے ہم نے ذرا وضاحت سے بحث کی ہے کہ آئندہ سلطنت دہلی کے طرز بادشاہی سمجھنے میں مدد ملے۔ اس بارے میں فن سیاسیات کی جو اصطلاحیں ملتی ہیں، اُن میں سے کوئی بھی ایسی نظر نہیں آتی جو اس قسم کے طرز حکومت پر چسپاں ہو۔ اسی لیئے ہم نے "ترک شاہی" کی نئی اصطلاح وضع کی تھی اور بے شبہہ "حکومت دہلی" کو ہم اکثر خصوصیات کے لحاظ سے یہی لقب دے سکتے ہیں۔ اور یہ وہ طرز حکومت تھا جس میں جمہوریت، حکومت شرفا (یا اُمرا) اور مطلق العنان موروثی بادشاہی کے تینوں عنصر جمع تھے۔ اس اعتبار سے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ مرتبے کا سپاہی نہ صرف بڑے سے بڑا عہدہ بلکہ آخر میں تخت سلطنت حاصل کرسکتا تھا، اس ترک شاہی میں جمہوریت کی شان تھی۔ اس لحاظ سے کہ بادشاہ کے انتخاب اور اہم ملکی معاملات میں صرف بڑے بڑے سردار دخل رکھتے تھے، اُسے حکومت اُمرا کہہ سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ بادشاہی کے لئے بادشاہ سابق کی اولاد کا حق مرجح مانا جاتا تھا نیز یہ کہ حکومت حاصل کرلینے کے بعد وہ کسی کی رائے یا مشورے کا قانوناً پابند نہ ہوتا تھا لہٰذا اُسے "مطلق العنان موروثی بادشاہی" کہنا بے بنیاد نہ ہوگا۔

وراثت شاہی کے اصول۔

مگر اس قسم کی اصطلاحی مُوشگافیوں میں اُلجھنا غیر ضروری ہے۔ طالبِ علم کے خاص طور پر یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ ہندوستان میں تُرک نژاد بادشاہوں کے زمانے تک منصبِ بادشاہی کبھی عام سطح سے اس قدر بلند نہیں ہوا کہ پھر اس تک کسی معترض کی رسائی نہ ہو۔ بے شبہہ یہ جلیل القدر عہدہ بعض اوقات محض شہزادگی یا جنگی کامیابی کے طفیل حاصل ہو جاتا تھا لیکن اس کے بعد بھی بادشاہ کو نہ صرف جنگی اور انتظامی قابلیت بلکہ عالی دماغی اور اخلاقی صفات میں اپنی برتری ثابت کرنی پڑتی تھی ورنہ وہ تختِ حکومت پر قائم نہ رہ سکتا تھا اور چند روز کی غفلت کافی ہو جاتی تھی کہ اُسے بزمِ عیش اور مسندِ جہانداری سے کھینچ کر زندانِ تاریک میں پہنچا دے۔ ہم عصر مورخ کے چند ہی جملوں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس عہد میں بادشاہی کی اہلیت کا معیار کیا تھا۔ سلطان رکن الدین کی معزولی کے اسباب بیان کرنے میں وہ لکھتا ہے کہ "بادشاہاں را ہمہ معنی (یعنی ہمہ صفات) جمع باید۔ عدل باید تا رعیت آسودہ ماند۔ احسان باید تا حشم (یعنی ملازمین) آسودہ مانند۔ لہو و طرب و مخالطت با ناجنسان و خسیساں موجب زوالِ سلطنت گردد۔۔۔"[1]

نئے بادشاہ کو بھی مذکورہ بالا معیار کے مطابق اپنی اہلیت ثابت کرنے کے لئے نو برس تک جدوجہد کرنی پڑی۔ اور اگر اس میں ناکامی کے باوجود اس کی بادشاہی سلامت رہی تو اس کا سبب محض یہ تھا کہ آخر کار اُس نے اپنی کم اہلی کو گویا تسلیم کر لیا اور سلطنت کی باگ اُس شخص کے ہاتھ میں دے دی جو اپنے زمانے میں اُس کی سب سے زیادہ اہلیت رکھتا تھا۔ واضح رہے کہ ناصر الدین محمود کی شرافت و فیاضی، اور عدل و رعایا پروری میں کسی کو بھی کلام نہ تھا۔ اس کے ایثار و کسرِ نفسی نے ہر شخص کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا اور اُس کی دینداری کے بہت سے قصے آج تک فارسی تاریخوں میں محفوظ و مشہور ہیں۔ اسی ہر دلعزیزی کی بدولت اُس کی تخت نشینی کی رسم بڑی دھوم دھام سے دہلی میں منائی گئی[2] (۲۳-۲۴ محرم ۶۴۴ھ / ۱۲۴۶ء) اور بادشاہ ہونے کے بعد بھی اُس نے حرفِ گیروں کو کسی

ناصر الدین کی کم اہلی۔

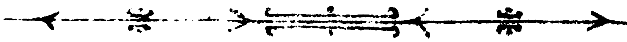
---

[1] طبقاتِ ناصری صفحہ ۱۸۵ کلکتے کے مطبوعہ نسخے میں کچھ غلطی رہ گئی ہے۔ دیکھو ترجمہ راورٹی صفحہ ۶۳۷،۶۳۸۔

[2] ہمارے مورخ مولانا منہاج الدین نے بھی اس موقع پر دو نظمیں لکھی تھیں ان میں سے پہلے قصیدے کا یہ مطلع مشہور ہے:- آں شہنشاہے کہ حاتم بذل و رستم کوشش است ؛ ناصر دنیا و دیں محمود بن التمش است۔

خاص شکایت کا موقع نہیں دیا بایں ہمہ اُس میں انتظامی قابلیت کی کمی تھی اور اتنی استعداد وقوت نہ رکھتا تھا کہ شنفی یا شورہ پشت طبائع کو فساد اٹھانے کی جرأت نہ ہو۔ چنانچہ اس کی نرمی اور مروت نے دربار ہی میں اُمرا کے دو فریق کردئے جن میں سے ایک **غیاث الدین بلبن** کے ساتھ تھا اور دوسرا **عماد الدین ریحانی** سے مل گیا تھا؛

ان میں غیاث الدین بلبن، بہرام شاہ کے وقت سے حاجب کے عہدے پر ممتاز تھا (جسے اِس زمانے کی اصطلاح میں "چیف سکرٹری" کہنا غلط نہ ہوگا) اور پھر اپنی کارگزاری کے صلے میں "نائب الممالک" کے منصب جلیل اور "اُلغ خاں" یعنی خان بزرگ کے لقب سے سرفراز ہوا تھا (۶۴۷ھ ۱۲۴۸ء) بایں ہمہ چند سال کی ریشہ دوانی سے ریحانی کے ساتھ (جو غالباً خواجہ سرا تھا) بعض عمائد سلطنت بھی شریک ہوگئے اور اُن کی مخالفت نے ۶۵۱ھ ۱۲۵۱ء میں بلبن کو دربار سے خارج کردیا؛ معتوب امیر کو ناگور کا مقطع یا صوبہ دار بنا کر دربار سے علحدہ کیا گیا تھا؛ لیکن اُس کے ہٹتے ہی ملک میں جا بجا شورش ہونے لگی اور دو ہی سال میں ناصر الدین کو معلوم ہوگیا کہ بلبن کے بغیر بادشاہی کرنا دشوار ہے۔ اسے بادشاہ کی کسر نفسی کہو یا انصاف و ایمان داری کہ پھر اس نے بہت جلد بلبن سے مصالحت کرلی اور یہ کہہ کر حکومت اُسے سونپ دی کہ "میں تجھے اپنا نائب بناتا ہوں اور اُمور سلطنت کا تمام اختیار تیرے ہاتھ میں دیتا ہوں۔ تو کوئی ایسا کام نہ کیجو کہ کل خدا کے حضور میں اس کا جواب نہ بن پڑے اور مجھے اور تجھے اُس دربار میں خجل ہونا پڑے[1]"؛



[1] منتخب التواریخ ۸۹۔ طبقات اکبری ۵۳؛

باب ۲

سلطنت دہلی کا پہلا عروج

حضرت دہلی کنف دین و داد — جنت عدن است کہ آباد باد
ہست چو ذات ارم اندر صفات — حرسہا اللہ عن الحادثات!
(قِرانُ السعدین)

پہلی فصل ۔ غیاث الدین بلبن

آیندہ بتیس تینتیس برس تک کشورِ ہند پر اُلغ خانِ اعظم یا غیاث الدین بلبن کی حکومت رہی۔ لیکن مختارِ کار اور نائب شاہ ہونے کے باوجود، سلطان ناصر الدین کی زندگی تک (یعنی ۶۵۳ھ / ۱۲۵۳ء سے ۶۶۴ھ / ۱۲۶۶ء تک) بلبن سلطنت کے نظم و نسق میں وہ ضبط و بستگی نہ پیدا کر سکا جو اُس کے عہد بادشاہی کی خصوصیت ہے! اس کا ایک سبب تو ظاہر ہے کہ وہ ابھی تک باآں ہمہ اختیارات بادشاہِ وقت کا ماتحت عہدہ دار تھا۔ مگر اس کا پورا

دخل نہ ہونے کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ وہ یہ کہ ابھی سلطنت کے مختلف اقطاع پر اُن "ملوک شمسی" کا تسلط تھا جو بلبن کے ہم قوم و ہم چشم تھے اور پچھلے پندرہ بیس برس میں اس درجہ سرکش ہو گئے تھے کہ انھیں برائے نام مرکزی سلطنت کا مطیع و باج گزار رکھنا اور خود مختار بادشاہ نہ ہونے دینا ہی بلبن کی بڑی کارگزاری اور کامیابی نظر آتی تھی۔

"ترکان چہل گانی" یہ ملوکِ شمسی، بلبن کی طرح سلطان شمس الدین کے ترک غلام تھے اور انھیں بادشاہ نے تربیت دے کر سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں پر مامور کر دیا تھا۔ غالباً اُس کی زندگی ہی میں ان کی وہ جماعت مرتب ہوئی جسے "ترکان چہل گانی" کے نام سے موسوم کرتے تھے اور اگر مورخ ضیاءُالدین برنی کا قول صحیح ہے تو انھی غلاموں نے بعد میں اُن آزاد اُمرا اور شہزادوں کو بھی امور سلطنت سے بے دخل کر دیا جو چنگیز خانی سیلاب سے بچ کر بھاگے اور دربار دہلی میں کمال قدردانی کے ساتھ جلیل القدر مناصب پر سرفراز کر دیئے گئے تھے[1]۔

طبقات ناصری سے بھی بالواسطہ مذکورۂ بالا قول کی تائید ہوتی ہے کیونکہ اس تاریخ

---

[1] تاریخ فیروز شاہی (مولفہ ضیاءُالدین برنی) صفحہ ۲۶ و ۲۷۔

جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے یہ تاریخ سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہد میں تالیف ہوئی تھی اور مولف کا دعویٰ ہے کہ اُس نے طبقات ناصری کے بعد ہندوستان کی تاریخ کا گسستہ سلسلہ جوڑ دیا ہے۔ لیکن اول تو عہد ناصر الدین محمود کے آخری چھ سال کے حالات کا جنھیں صاحب طبقات تحریر نہ کر سکا تھا، پتا نہیں چلتا دوسرے بلبن کے متعلق بھی جو کچھ ضیاءالدین برنی نے لکھا ہے وہ کافی نہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ بعض جگہ مورخ اپنی کوتاہی معلومات کو انشاپردازی کے زور سے پورا کرنا چاہتا ہے جس کی وجہ سے اس زمانے کے بعض انگریز اہل تحقیق کی نظر میں اِس کتاب کی طرف سے کسی قدر بدظنی پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن ایک تو کسی اور ہم عصر مورخ کی تحریر موجود نہیں* دوسرے برنی کے شاعرانہ طرزِ تحریر کو دیکھ کر یہ قیاس کرنا کہ وہ صحت و تحقیق کی پروا نہیں کرتا درست نہ ہوگا پھر یہ کہ شاہانِ خلجی و تغلق کے متعلق اُسے معلومات بھی کافی حاصل ہو گئی تھی جسے وہ نہایت خوبی کے ساتھ لکھتا اور اس زمانے کے مورخوں کی طرح کہیں کہیں رائے زنی اور تنقید کرتا جاتا ہے۔

* راورٹی اور بعض دیگر اہل تحقیق کا یہ خیال صحیح نہیں کہ برنی کے علاوہ اس زمانے کی تاریخ کسی نے

باب ۲

کے بائیسویں طبقے میں جن مقتدر اُمرا کے (" ملوک شمسیہ" کے عنوان سے) حالات لکھے ہیں، وہ سب سلطان شمس الدین کے تُرکی غلام اور عمر و اقتدار کے لحاظ سے اکثر بلبن سے بھی بڑے تھے۔ لیکن اول تو موت اور باہمی نا چاقی نے ان کی جماعت کو کمزور کر دیا دوسرے مرکزی حکومت میں کامل دخل پاتے ہی بلبن نے اپنی قوت اس قدر بڑھالی کہ کسی صوبہ دار کو علانیہ دربار دہلی سے انحراف کرنے کی بمشکل جرأت ہو سکتی تھی۔[1] پھر جب سلطان ناصر الدین محمود کی وفات کے بعد تخت دہلی نے اس کے قدم سے زینت پائی تو دیگر اسباب قوت و بالا دستی کے ساتھ اُس نے وہ شعائر عظمت و جلال بھی اپنی بادشاہی کے لوازم قرار دئے جنھیں دیکھ کر ساسانی بادشاہوں کا رعب و دبدبہ یاد آجاتا تھا۔

"دبدبۂ شاہی"

عہد بلبن کے شاہانہ طرز ماندوبود کی مورخ نے نہایت دلکش تصویر کھینچی ہے اور لکھا ہے کہ جس وقت اُس کا دربار آراستہ ہوتا یا سواری چلتی تو صدہا نقیب و چاؤش، پیادہ و سرہنگ، اُمرا اور فوجی سردار اس کے گرد و پیش ہوتے تھے۔ ملک سیستان کے دیو ہیکل جوانوں کو خاص اس کام کے لئے بیش قرار تنخواہیں دے کے نوکر رکھا گیا تھا کہ وہ ننگی تلواریں کندھوں پر رکھے بادشاہ کی خواصی میں رہیں۔ اور اس شان محمودی اور شوکت سنجری کے ساتھ جس وقت بادشاہ برآمد ہوتا یا سوار ہو کر چلتا تو قدم قدم پر صدائے بسم اللہ اس زور سے بلند ہوتی تھی کہ بازار و جنگل گونج جاتے تھے اور حاضرین کے بدن میں، جو سو سو دو دو سو کوس سے چل کر خاص یہ تماشا دیکھنے دلی آتے تھے، لرزہ پیدا ہو جاتا تھا بلکہ بعض اوقات نئے آدمی جو حضور میں باریاب ہوتے، خواہ وہ کہیں کے سفیر ہوں یا ہندوستان ہی کی کسی ریاست کے راجہ یا راج کمار، تو وہ "خاکبوس" یعنی سلام کے وقت خوف سے گر پڑتے یا بیہوش ہو جاتے تھے۔[2]

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ نہیں لکھی۔ ایک کتاب "ملحقات طبقات ناصری" کا تو فرشتہ ہی خاص طور پر ذکر کرتا ہے (صفحہ ۷۵) جو عین الدین بیجاپوری نے لکھی تھی اور بظاہر اب نایاب ہے۔

[1] معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت نہ صرف ناصر الدین کی اولاد میں بلکہ خاندان شمسی میں بھی کوئی مرد زندہ نہ تھا جو سلطنت کی وراثت کا مدعی ہوتا۔ (دیکھو راورٹی صفحہ ۷۶۲)۔

[2] برنی صفحہ ۳۰۔

اور یہ باتیں بلا سوچے سمجھے یا محض خود پسندی کی بنا پر نہ تھیں بلکہ بلبن کے نزدیک بادشاہی کا اصول ہی یہ تھا کہ لوگوں کے دلوں پر بادشاہ کا رعب و دبدبہ مستولی ہو جائے تاکہ مفسدوں کو فتنہ وفساد کی اور ظالموں کو کمزور کے ستانے کی جسارت نہ ہو سکے۔ وہ بارہا کہتا تھا کہ جب تک بادشاہ «حرمت وحشمت خود، در ترتیبِ بار و کوکبۂ سواری و در نشستن وخاستن بہ آداب و رسومِ اکاسرہ، محافظت نہ نماید و در جمیع احوال واقوال وافعال وحرکات و سکناتِ او حشمت بادشاہی مشاہدہ نہ شود، رعب از دلِ خصمان بلاد ملک او نہ نشیند وہیبت او وہیبت اُمرا (یعنی عمالِ او) در دل رعایائے ممالک او منقش نہ شود... و (دریں صورت) در کارہائے ملکی خلل افتد و تمردِ رعایا بار آرد واز تمردِ رعایا شخص ملک (یعنی جسم ملک) مریض شود..»[1]

عدل اور دینداری

بلبن کو اس بات کا اقرار تھا کہ ایرانی اکاسرہ کی یہ تقلید اور خود پرستی وعظمت نمائی کے یہ طریق اسلامی تعلیم کے سراسر خلاف اور شرک میں داخل ہیں لیکن وہ حجت پیش کرتا تھا کہ بادشاہ کا اعتقاد صحیح اور نیت درست ہو اور اس قسم کے افعال سے اس کا مدعا محض حق کی حمایت اور عدل وامن کا قیام ہو، تو وہ مواخذے سے بری ہے[2]۔ اور واقعات گواہی دیتے ہیں کہ بلبن اس بارے میں جو کچھ کہتا تھا، حقیقت میں ایسا ہی سمجھتا اور اسی کے مطابق عمل بھی کرتا تھا۔ مظلوم کی دادرسی اور عدل کرنے کے وقت کسی دنیاوی مصلحت یا مروّت کی اسے پروا نہ ہوتی تھی چنانچہ منجملہ اور شواہد کے یہ قصہ لائق ذکر ہے کہ ایک مرتبہ بادشاہ کے معتمد علیہ صوبہ دار بداؤں نے غصے کی حالت میں کسی فراش کو اتنا پٹوایا کہ وہ ہلاک ہو گیا۔ اتفاق سے کچھ عرصے بعد خود بلبن بداؤں گیا۔ اس وقت فراش کی بیوہ نے حضور میں نالش کی اور جب واقعے کی تصدیق ہو گئی تو بادشاہ نے حکم دیا کہ اس عورت کے سامنے کھڑا کر کے مجرم صوبہ دار کے اتنے درّے مارے جائیں کہ وہ ہلاک ہو جائے! اس حکم کی تعمیل ہوئی اور ساتھ ہی بداؤں کا برید یعنی ڈاک کا عہدہ دار بھی جس نے اس واقعے کی بادشاہ کو اطلاع نہ دی تھی

---

[1] برنی صفحہ ۳۱، ۳۲

[2] برنی۔ صفحہ ۴۱۔

سولی پر لٹکا دیا گیا[1]

ذاتی اوصاف

بادشاہ کی سخت گیری پر مورخ نے سخت اعتراض کیا ہے اور لکھا ہے کہ سیاسی مجرمین یعنی بغاوت اور شورش کرنے والوں کو وہ نہایت بے رحمی سے سزا دیتا تھا اور اس بارے میں مشروع و نامشروع کا بھی چنداں لحاظ نہیں کرتا تھا[2] مگر اُس کو اعتراف ہے کہ اسی کے ساتھ محتاجوں کی امداد اور بے کسوں کی دستگیری، اور ویران علاقوں کو آباد کرنے میں اس کی رعایا پروری ضرب المثل ہوگئی تھی۔ ضعیفوں اور بیوہ، یتیموں کا اُس سے زیادہ ہمدرد اور خبر گیراں سردار ہندوستان بھر میں کوئی نہ تھا۔ اپنے غریب اور زخمی یا بیمار سپاہیوں کے ساتھ اُس کی مہربانی مشہور تھی کہ سفر کے وقت دشوار گزار مقامات پر بادشاہی سواریاں اُن کے واسطے وقف کردی جاتی تھیں اور جب تک وہ اُس مقام سے بہ آرام نہ گزر جاتے بلبن آگے نہ بڑھتا تھا۔ جوانی میں اپنی فیاضی کی بدولت وہ ایک مُسرف اور عیش دوست امیر زادہ نظر آتا تھا، لیکن تاج شاہی سر پر رکھتے ہی اُس نے تمام لغو مشاغل کو خیر باد کہی اور وہ اعتدال و تقویٰ اختیار کیا جو اس کے آقا سلطان شمس الدین کا امتیازی وصف سمجھا جاتا تھا۔ ہندوستان میں اُس وقت بڑے بڑے نامور اسلامی علما اور مشایخ جمع تھے۔ بلبن ان کی نہایت تعظیم و توقیر کرتا تھا اور ہر جمعے کو نماز کے بعد خود اُن کے مکان پر حاضر ہوتا اور اُن کے وعظ و نصائح کو کمال انکسار وادب سے سُنتا تھا۔

ملکی خدمات

(۱) دفاعی

اِن عجیب اوصافِ ذاتی کے ساتھ وہ نہایت بیدار مغز خادمِ ملک تھا اور ہندوستان پر اُس نے جو احسانات کئے ہیں، اُن میں سب سے پہلے ہم اُس کے دفاعی انتظامات کا ذکر کریں گے کیونکہ مغلوں کے سرحدی ممالک پر مسلط ہو جانے سے اُن دنوں اس ملک کے واسطے جو مستقل خطرہ پیدا ہو گیا تھا، ایسا نہ غالباً کبھی پہلے ہوا تھا نہ اس کے بعد۔ اور یہی سبب تھا کہ دور اندیش بلبن نے دفاعِ ہند کی خاطر کشور کشائی اور ملک گیری کی ہوس کو دل سے بھلا دیا تھا اور اس کے اُمرا ہندوستان کی غیر مفتوحہ ریاستوں پر فوج کشی کا مشورہ

---

[1] برنی صفحہ ۵۴۔ بعد کی تمام معتبر تاریخوں میں بھی یہ قصہ منقول ہے۔

[2] برنی صفحہ ۴۷۔

دیتے تو وہ ہمیشہ یہ جواب دیتا تھا کہ حکومتِ دہلی کا پہلا فرض اُن علاقوں کو محفوظ رکھنا ہے جو پہلے سے اُس کے قبضے میں آچکے ہیں اور آج کل جب کہ مغلوں کے گروہ ہماری سرحد پر منڈلاتے پھرتے ہیں، اگر ہم بیرونی فتوحات کے لئے اپنی فوجی قوت منتشر کردیں گے تو یہ دفاعی فرض ادا نہ ہوگا۔[1]

یہاں یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہندوستان کی قدرتی فصیل یعنی کوہستانِ سلیمان سے ان دنوں حکومتِ دہلی کوئی دفاعی فائدہ نہیں اٹھا سکتی تھی۔ سبب یہ کہ دریائے جہلم کو اترتے ہی مغرب میں جو پہاڑی علاقہ شروع ہوجاتا ہے وہ بہت کم آباد اور ناقابلِ زراعت تھا اور سامانِ رسد کی قلت کی وجہ سے وہاں کسی بڑی فوج کی چھاؤنی نہیں بن سکتی تھی؛ یہاں کے نیم متمدن اور جنگجو قبائل بھی جو باعتبارِ قومیت "کھوکھر" کہلاتے ہیں، ہمیشہ ہندوستان کی دشمنی پر تلے رہتے تھے اور جس کسی حملہ آور نے دریائے سندھ کو عبور کیا۔ یہ لوٹ کے لالچ میں ہمیشہ اس کے ساتھ ہوگئے۔

اُس عہد کی دفاعی مشکلات

آج کل جب کہ ریل نے رسد رسانی کی مشکلات کا ازالہ کردیا ہے اور کوہ سفید کے مغرب میں ہیں دوآبہ "سندھ ساگر" سے بھی کم آبادی نظر آتی ہے، ہم اگر کوہستانِ سلیمان کو اپنے ملک کا سب سے مستحکم دفاعی حصار تصور کریں تو بالکل حق بجانب ہوں گے۔ لیکن ساتویں صدی ہجری میں معاملہ برعکس تھا اور افغانستان کے پہاڑوں میں اتنی کثیر جنگی آبادی پرورش پاتی تھی کہ مثلاً غزنی کو مرکزِ جنگ بنا کر شمالی ہند کو فتح کرنے کی تیاریاں کرنا کچھ دشوار نہ تھا اور یہی وہ اہم قدرتی اسباب ہیں جن کی بدولت سلطنت دہلی کی ابتدائی تاریخ اور عہدِ مغلیہ کی تاریخ میں ایک بڑا فرق پیدا ہوگیا۔ یعنی یہ کہ بابر و اکبر کے عہد سے پہلے، جب تک کہ ملک افغانستان کشورِ ہند کا بیرونی مورچہ نہ بنا، ہندوستان خاص کے رہنے والوں کو کبھی بیرونی حملوں کے خوف سے نجات نہ ملی۔

ایک اور دقت یہ تھی کہ سلطنت دہلی کی فوج میں ابھی تک غالباً صرف سپاہی پیشہ مسلمان بھرتی ہوتے تھے اور اُن کی کل تعداد ہندوستان میں اتنی زیادہ

[1] بلبن کی اس حکمت عملی اور اس کے متعلق مباحث و دلائل کے لئے دیکھو برنی صفحہ ۵۰ و ۵۱۔

باب ۲

نہ تھی کہ بلا دقت مغل حملہ آوروں کو روک لے۔ خاص کر اس وجہ سے، کہ ان حملہ کرنیوالوں کا مقصود اکثر لوٹ مار کے سوا اور کچھ نہ ہوتا تھا اور قزاقوں کی طرح گروہ در گروہ جدھر سے میدان خالی پاتے، ملک میں گھس آتے اور جب گھرنے کا اندیشہ ہوتا تو اسی تیز پائی سے فرار ہو جاتے تھے۔ بایں ہمہ یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ نہایت جری اور خونخوار لڑنے والے تھے۔ شجاعت میں غالباً صرف ایک ہی قوم اُن سے بازی لے جاسکتی تھی۔ یعنی ترک، جنھوں نے اپنی قلتِ تعداد اور پیہم ناکامیوں کے باوجود مغلوں کے دل پر اپنی شمشیر زنی کا سکہ بٹھا دیا تھا، اور اسے ہندوستان کی خوش قسمتی سمجھنا چاہیئے کہ دو فتنۂ مغول" کے زمانے میں یہاں بھی اسی قوم کے افراد حکومت کرتے تھے۔

لاہور کی از سر نو تعمیر

سلطان ناصر الدین محمود کے عہد میں اِن خوفناک حملہ آوروں کو روکنے کی دشوار خدمت **ملک شیر خاں** سنقر کے سپرد ہوئی تھی جو بلبن کا عم زاد بھائی تھا اور اُس نے یہ خدمت جس مستعدی اور خوبی سے ادا کی اُس کی ہر مورخ نے تعریف کی ہے[1] لیکن سچ تو یہ ہے کہ لاہور کے تاراج و مسمار ہونے کے بعد شمالی پنجاب کو مغلوں کے ناگہانی حملوں سے بچانا محال ہو گیا تھا، اور چناب کے پار تمام علاقے کو پامال کر دینے سے مغلوں کا مقصد بھی یہی تھا کہ سلطنت دہلی اس حصے میں کوئی بڑا جنگی مرکز قائم کرنے نہ پائے۔ اِس مقصد میں کھوکھروں کی غارت گر قوم بلامنت ان کی حلیف ہو گئی اور جب تک بلبن نے اِن غداروں کو سخت سزائیں نہ دیں، لاہور کا علاقہ ویران و بے چراغ رہا اور سرحد کا سب سے بڑا دفاعی مرکز جنگ بہت دور جنوب میں **شکرد پالپور** میں قائم کرنا پڑا۔ اس واقعے نے بے شبہ دپالپور کی رونق و منزلت بڑھا دی لیکن لاہور کو ایسی خراب حالت میں چھوڑ دینے کے معنی یہ تھے کہ گویا سلطنتِ دہلی شمال مغربی پنجاب کی حفاظت کا ذمہ لینے سے ہچکچاتی ہے۔ چنانچہ گو اقطاع لاہور کا مقطع یا والی حکومت دہلی کی طرف سے نامزد ہوتا تھا لیکن قرائن سے پایا جاتا ہے کہ اُسے بعض اوقات مغلوں کے ساتھ بطور خود معاملہ کرنا پڑتا تھا اور وہ ایک حد تک اُن کا ماتحت سمجھا جاسکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ بلبن کو یہ بات گوارا نہ ہو سکتی تھی اور عجب نہیں کہ شیر خاں سے اُس کی ناراضی کا یہی سبب ہو کہ وہ (یعنی شیر خاں)

[1] طبقات ناصری صفحہ ۲۷۷۔ برنی صفحہ ۶۵ وغیرہ

شیر خاں) غالباً مغلوں کے شہنشاہ **منگو خاں** سے بھی سیاسی تعلقات رکھنے چاہتا تھا[1]۔

الغرض، ملک کے اندرونی انتظامات سے فرصت ہوتے ہی بلبن خود لاہور گیا اور اُس نے ازسرِ نو شہر اور قلعے کی تعمیر کی (۶۶۹ھ) نیز سلطنت کی طرف سے بہت سے معمار خاص اس کام پر مقرر کر دئے کہ نواح لاہور کے دیہات میں رعایا کے مکانات بنائیں۔ پھر غالباً یہاں کے قدیم باشندوں کو جو متفرق اور نہایت شکستہ حال ہو گئے تھے لا لا کے بسایا اور ان اضلاع میں نئے سرے سے زندگی پیدا کی کیونکہ اتنے عرصے (یعنی چالیس برس) تک ویران رہنے کے باعث یہاں کے دیہات میں رہنے کے گھر تو درکنار پانی پینے کے لئے کنوئیں تک باقی نہیں رہے تھے[2]۔

شہزادہ محمد

اقطاع لاہور کو آباد کرنے کے ساتھ ساتھ بلبن نے ممالک سندھ و ملتان پر خاص توجہ کی جو حقیقت میں ملک پنجاب کا بازو تھے۔ اِن اقطاع پر اُس نے سلطنت کے بہترین اشخاص کو حاکم مقرر کیا اور اُن کا صدر صوبہ دار اپنے بڑے بیٹے شہزادہ محمد کو بنایا جس کی حکومت میں ساحل بحر سے دریائے جہلم تک تمام علاقہ داخل تھا اور مستقر ملتان تھا۔ اِس شہزادے کی علم دوستی اور اعلیٰ اخلاق کی مدح وثنا میں مورخین اور ہم عصر شعرا نے ورق کے ورق تحریر کئے ہیں لیکن اُس کی انتظامی اور جنگی قابلیت کی شاید بہترین سند یہ ہے کہ بلبن جیسا سخت گیر و نکتہ چیں بادشاہ دل سے اُن کا معترف تھا اور اسی لیے اُس نے شہزادۂ موصوف کو "قاآن ملک" کا خطاب دے کر ان اقطاع پر بھیجا تھا جہاں مخلص و خیر خواہ ہونے کے علاوہ نہایت لائق اور مستعد حاکم کی ضرورت تھی۔

اُس نے بارہ تیرہ سال تک یہ دشوار خدمت جس کامیابی سے انجام دی وہی اس بات کا ثبوت ہے کہ بلبن کا انتخاب و اعتماد بیجا نہ تھا۔ اس تمام مدت میں مغلوں کی کسی بڑی جماعت کو شمالی چناب کے عبور کرنے کی جرات نہ ہوئی اور ملتان و سندھ

---

[1] منگو بن تولی بن چنگیز ۶۴۹ھ میں تخت نشین ہوا۔ اس کے دربار میں شیر خاں کے حاضر ہونے کا ذکر اجمالی طور پر ہم عصر تاریخ میں موجود ہے (طبقات ناصری۔ صفحہ ۲۷۷)۔

[2] برنی۔ صفحہ ۶۱۔

باب ۲

پنجاب سے بھی زیادہ محفوظ ہو گئے"۔ یہ شہزادہ علمی مشاغل میں نہایت انہماک رکھنے کے باوجود، صعوبات جنگ برداشت کرنے سے کبھی دل نہ چُراتا تھا اور جب کبھی مغل حملہ آوروں کے سرحدوں کی طرف آنے کی خبر ملتی، اسی وقت وہ مجلس علما کو چھوڑ کر لباس سپاہیانہ پہن لیتا اور خود مقام مخدوش پر پہنچ جاتا تھا۔ حتیٰ کہ مدافعت ہندوستان کا یہی فرض ادا کرنے میں اُس کی جان گئی اور وہ مغلوں کے تیسرے بڑے حملے میں شہید ہوا (۶۸۴ھ ۱۲۸۵ء)۔ بوڑھے باپ کو ایسے لائق اور جوان بیٹے کی موت کا جو کچھ صدمہ ہوا ہوگا اس کا ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے لیکن یہاں خاص طور پر جتانے کے قابل یہ بات ہے کہ گو اس مرتبہ مغل بڑے جوش و خروش کے ساتھ اپنے پچھلے نقصانات کا انتقام لینے کے لیے ہندوستان آئے تھے اور ان کا سردار تیمور (یا تمر خاں بھی بڑا بہادر و آزمودہ کار سپہ سالار مانا جاتا تھا لیکن عہد بلبن کے دفاعی انتظامات کی بدولت اول تو وہ کسی بڑے شہر پر حملہ نہ کر سکے دوسرے کھلے میدان کی دونوں لڑائیوں میں اہل ہند نے انھیں شکست دی اور یہ محض اتفاق تھا کہ فتحمند شہزادہ تھوڑی سی جمعیت کے ساتھ اپنے لشکر سے (جو مفرورین کے تعاقب میں آگے بڑھ گیا تھا) الگ رہ گیا۔ مغلوں کا ایک دستہ کمین میں چھپا بیٹھا تھا۔ شہزادۂ محمد کی قلیل جماعت دیکھ کر اس نے حملہ کیا اور گو میدان سے بچ کر نکل جانا دشوار نہ تھا لیکن محمد نے شجاعت کے جوش میں احتیاط کو بزدلی جانا اور بے شبہ وہ اپنی بہادری سے یہ لڑائی بھی جیت جاتا کہ ناگہاں ایک تیر اس کے ایسا کاری لگا کہ اسی وقت روح پرواز کر گئی۔ ساتھیوں میں سے کچھ لوگ بھاگ گئے اور باقی مارے گئے یا مغلوں نے انھیں اسیر کر لیا۔ حضرت امیر خسروؒ بھی جو اس شہزادے کے محبوب مصاحبوں میں تھے غالباً اسی مقام پر قید ہوئے اور دو برس تک بلخ میں قید رہنے کے بعد بہ مشکل چھوٹ کر ہندوستان آئے۔[1]

---

[1] اس لڑائی کے واقعات کسی جگہ عمدہ ترتیب و وضاحت کے ساتھ نہیں ملتے۔ ضیاء الدین برنی نے انھیں بہت مختصر طور پر لکھا ہے (صفحہ ۱۱۰) طبقات اکبری اور منتخب التواریخ نے غالباً یہ حالات حضرت امیرؒ کی کسی کتاب سے نقل کئے ہیں۔ جو اب نایاب ہے مگر فرشتہ (صفحہ ۸۲) کا ماخذ کوئی اور تاریخ ہے۔ نیز دیکھو الفنسٹن صفحہ ۳۷۳ (بحوالہ ہملٹن وغیرہ)

باب ۲ اس واقعے کی یادگار

اس اندوہناک سانحے نے ہندوستان میں جا بجا کہرام ڈال دیا اور اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ اس واقعے کو دیکھنے والے اور بیان کرنے والے میر حسن اور امیر خسروؒ جیسے سحر بیان لوگ تھے جن کے نظم و نثر میں مرثیے پڑھ کر آج بھی شہزادہ محمد کی موت کا رنج تازہ ہو جاتا ہے۔ خاص کر حضرت امیرؒ کا ایک ترکیب بند اس قدر درد انگیز ہے کہ سعدی شیرازیؒ کے مرثیۂ بغداد کے بعد اس عہد کی فارسی نظم میں اس کی نظیر ملنی دشوار ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے اسے لکھتے وقت بھی سعدی کا مذکورہ بالا مرثیہ شاعر کے پیش نظر تھا۔[۱]

ملکی خدمات:۔ (۲) امن و انتظام

محمد کی ہر دلعزیزی اور جوانمرگی کے علاوہ، اس واقعے کے اتنے رنج کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ بلبن کے انتظام و اقبال کی بدولت بہت دن سے اہل ہند ایسے امن و آرام سے زندگی بسر کر رہے تھے کہ مغلوں کے ساتھ یہ معمولی لڑائی بھی انھیں ایک جنگ عظیم نظر آئی جس نے کچھ عرصے کے لیے ان کے راحت و سکون میں خلل ڈال دیا۔

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ہندوؤں کے آخری زمانے میں طوائف الملوکی نے

۱۔ صاحب منتخب التواریخ نے اسے امیر خسروؒ کے دیوان غرۃ الکمال سے تمام و کمال نقل کیا ہے۔ عام طرز بیان دکھانے اور مرثیۂ سعدی سے اس کا تعلق ظاہر کرنے کے لیے چند شعر اس جگہ لکھنے دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے:۔

بند اول:۔

واقع است ایں یا بلا از آسماں آمد پدید
آفت است ایں یا قیامت در جہاں آمد پدید

بند نہم:۔

مہر و مہ بر روئے آں فرخ لقا بگریستند
روز و شب بر سال آں اندک بقا بگریستند

شہزادہ محمد کی جوانمرگی اور اہل ملتان کے رنج و غم کا ذکر کرتے ہیں:۔

〃 خلق ملتاں، مرد و زن مویہ کناں موکناں
کوبہ کو و سو بہ سو جا بجا بگریستند
از خروش گریہ و بانگ دہل شب کس نہ خفت
بس کہ در ہر خانۂ اہل عزا بگریستند"

ملک میں سخت بد نظمی پیدا کر دی تھی اور قومیں کی قومیں رہزنی اور قزاقی کو اپنی جائز وجہ معاش سمجھنے لگی تھیں، مسلمانوں کی فتح نے جب اس طوائف الملوکی کا خاتمہ کیا تو اسی کے ساتھ رہزنی میں بھی کمی ہو گئی بایں ہمہ اس بلا کا ملک سے استیصال نہیں ہوا۔ گھنے جنگلوں اور دشوار گزار پہاڑی علاقوں میں وحشی قبائل کے بہت سے گروہ آباد تھے جن کا پیشہ رہزنی تھا۔ اگر انصاف سے دیکھئے تو آج بھی، جب کہ انتظام حکومت میں بہت سی آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں، ہندوستان سے رہزنی کا کلی استیصال نہیں ہوا ہے اور کم آباد حصوں میں بعض اوقات بڑے بڑے ڈاکوؤں کی خبریں سننے میں آتی ہیں۔ پس ان دنوں جبکہ شمالی ہند کی آبادی کم تھی اور بہت سے علاقوں میں بڑے بڑے جنگل اور خوفناک بن کھڑے تھے، یہاں کے موروثی قزاقوں کا سدباب کرنا کچھ آسان بات نہ تھی، کم سے کم شمالی ہند پر بلبن کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ سب سے پہلے اسی نے وسیع پیمانے پر اس کام کا بیڑا اٹھایا، اور دہلی کے شمال سے ملک اودھ تک بڑے بڑے جنگل کٹوا کر ہزارہا قزاقوں کو تہ تیغ کیا اور جا بجا مستحکم قلعے اور تھانے بنا کے چھوٹی چھوٹی چھاونیاں قائم کر دیں۔

پائے تخت دہلی کے قریب پہاڑی جنگلوں کے علاوہ، ان قزاقوں کے سب سے بڑے مرکز پٹیالی، کاٹھیر اور کنپل میں تھے۔ ان میں پہلے دونوں مقام بداؤں کے قریب اور کنپل موجودہ فرخ آباد سے چند میل مغرب میں واقع ہے۔ بادشاہ نے ایک ایک کر کے ان تمام علاقوں کو صاف کیا اور بعض جگہ اس قدر بے رحمی سے کام لیا کہ عورتوں اور بچوں کے سوا کسی متنفس کو زندہ نہ چھوڑا اور آخر کار چند سال کی پیہم کوشش کے بعد ہندوستان خاص کو رہزنوں سے بالکل پاک کر دیا۔ ضیاء الدین برنی شہادت دیتا ہے کہ وہ "ڈاکوؤں کا شر رہزنی اور راستہ لوٹنے والوں کی بلا ہندوستان کے راستوں سے دور ہو گئی اور ہمارے زمانے تک کہ (بلبنی) قلعوں کی تعمیر اور تھانوں کے استحکام کو تین پشتیں گزر چکی ہیں، ہندوستان کے راستے جاری ہیں اور رہزنی کلیۃً موقوف ہو گئی ہے"[1]

[1] پہلی رہزنی اور بعد کے بلبنی انتظامات کو اس مورخ نے کافی تفصیل کے ساتھ تحریر کیا ہے۔

باب ۲
ملکی خدمات:۔
(۳) دہلی کی مرکزیت کا استحکام۔

رہزنی کا یہ استیصال، جس کے بغیر کوئی حکومت اپنے اندرونی انتظامات کو قابل تعریف نہیں سمجھ سکتی، بلبن کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ لیکن اس کے تدبر اور فرض شناسی کی غالباً سب سے اچھی دلیل یہ ہے کہ وہ ممالک ہندوستان کے سیاسی استحکام کا نہایت سرگرم حامی اور محافظ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ شمالی ہند میں ایک مرکزی سلطنت قائم کرنے کا منصوبہ اسے ایبک و التتمش سے ترکے میں ملا تھا۔ لیکن جہاں تک تحریری شہادت کا تعلق ہے بلبن پہلا "شہنشاہ دہلی" ہے جس نے مرکزیت یا شہنشاہی کے اصول کو، جس حد تک کہ وہ اس زمانے میں سمجھا جاتا تھا، بخوبی سمجھا اور جب موقع ملا، وضاحت سے سمجھایا۔ اور اس کا ثبوت وہ نصیحتیں ہیں جو، بنگالے کی بغاوت فرو کرنے کے بعد، وہاں اپنے چھوٹے بیٹے کو صوبہ دار بناتے وقت اس نے کی تھیں۔

بنگالے کی بغاوت۔

اس بغاوت کے متعلق فرشتہ کی یہ روایت قرین قیاس نظر آتی ہے کہ ۶۷۸ھ میں بادشاہ اس قدر علیل ہوا کہ مہینہ بھر تک محل سے باہر نہ آسکا اور دور کے شہروں میں اس کی وفات کی خبر مشہور ہوگئی[۱]۔ لکھنوتی میں ان دنوں بلبن کا ایک غلام ملک طغرل صوبہ دار تھا اور اس کی انتظامی قابلیت اور شجاعت، وسخاوت مسلّمہ تھی۔ اسی زمانے میں ریاست جاج نگر کے ساتھ اس کی جنگ ہوئی جس میں نمایاں فتوحات اور بیشمار مال غنیمت اسے حاصل ہوا تھا۔ یہاں یہ تصریح کردینی چاہیے کہ جاج نگر کی ریاست میں اس وقت مہانَدی سے گوداوری تک کا وہ علاقہ شامل تھا جو بعد میں جنوبی گونڈوانہ کہلایا اور اب صوبجات متوسط کا مشرقی حصّہ ہے۔ اس کے اور مسلمانوں کے مشرقی صوبوں کے درمیان "گڈھہ کٹنکہ" نامی علاقہ حائل تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہیں کہیں ریاست جاج نگر کی حدیں مہانَدی کے پار شمال تک پھیلی ہوئی تھیں اور اس قرب کی وجہ سے لکھنوتی کے اسلامی صوبہ داروں کی بارہا جاج نگر سے لڑائی

حاشیہ صفحہ گزشتہ:۔ (دیکھو صفحات ۵۷ تا ۶۰) نیز ملاحظہ ہو گزیٹیر۔ جلد ۱۴ صفحہ ۳۲۰۔ (حالات کیتھل)

[۱] فرشتہ صفحہ ۷۹۔

باب ۲

ہوتی رہتی تھی۔[1]

غرض کچھ جنگ جاج نگر میں فتحیابی کے غرور اور کچھ لکھنوتی کے بغاوت پسند[2] مصاحبوں کے اغوا سے طغرل بغاوت پر آمادہ ہوگیا۔ بظاہر اسے یہ بھی اطمینان تھا کہ بوڑھے بادشاہ کو رہزنوں کے استیصال، اور مغلوں کے حملے روکنے کے لیے پنجاب کے دفاعی انتظامات میں اس درجہ انہماک ہے کہ وہ بنگالے پر فوج کشی نہ کرے گا یا نہ کرسکے گا۔ کیونکہ بلبن کے ان اقوال کا (جنھیں ہم اوپر اجمالاً نقل کرچکے ہیں) تمام ہندوستان میں چرچا تھا کہ جب تک مغلوں کا غزنی پر تسلط قائم اور ان میں سرحد ہندوستان پر یورش کرنے کی قوت باقی ہے، حکومت دہلی کو اپنی پوری جنگی قوت ان کے دفاع کے لیے مجتمع رکھنی چاہئے اور خود ہندوستان کے ممالک یا ریاستوں کی فتح کا خیال دل سے بھلا دینا چاہئے۔ لیکن اگر طغرل غور کرتا تو یہ بات بہ آسانی سمجھ میں آجاتی کہ بلبن کی مذکورۂ بالا حکمت عملی کی وجہ ہی یہ تھی کہ وہ اپنے مقبوضات ہند کو زیادہ محفوظ اور منظم حالت میں رکھنے کا خواہاں تھا اور اندرونی استحکام اور ملکی صیانت پر سے اس نے شوق کشور کشائی اور ہوس نام آوری کو قربان کردیا تھا؛ پس جب اسے بنگالے کے سلطنت دہلی سے انقطاع تعلق کرنے کی اطلاع ملی تو رنج و غضب کی حالت میں "خواب و خور بر او تلخ گشت" اور اس کے غصے کو اس واقعے نے اور بڑھا دیا کہ وہ طغرل، جواب مغیث الدین کے لقب سے اپنی خود مختار بادشاہی کا

---

[1] ۔ ال فنسٹن اور بعد کے اکثر انگریز تاریخ نویسوں نے جاج نگر کے متعلق سخت مغالطہ کھایا ہے اور وہ اسے لکھنوتی کے مشرق میں موجودہ آسام کے قریب کا علاقہ سمجھتے اور طرح طرح کی غلطیاں کرتے ہیں۔ حالانکہ فارسی تواریخ کو غور سے پڑھ کر جاج نگر کا ٹھیک علاقہ معلوم کرلینا کچھ دشوار نہیں ہے اور حال میں ڈاکٹر بلوخ مین اور میجر راورٹی نے نہایت صحت و تحقیق کے ساتھ اس قدیم ریاست کی حدود معین کی ہیں۔ (راورٹی صفحہ ۵۸۸ وغیرہ)

[2] ۔ کم سے کم برنی کے وقت میں اہل بنگالہ اسی قسم کی شہرت رکھتے تھے اور دہلی کے لوگوں نے لکھنوتی کو "بلغاک پور" یعنی "بغاوت پور" کا لقب دے رکھا تھا؛ (برنی صفحہ ۸۲)

باب ۴

بلبن کی فوج کشی

اعلان کر رہا تھا، خود بلبن کا دست پروردہ اور معتمد علیہ غلام تھا!

ادھر، یکے بعد دیگرے، دو لشکروں کو جو بغاوت فرو کرنے کی غرض سے بھیجے گئے، طغرل نے شکست دی۔ ان کامیابیوں میں اس کی بہادری اور کثرتِ فوج کے علاوہ رشوت ستانی کو بھی دخل تھا اور بادشاہی لشکر کے بہت سے سردار روپے کے لالچ میں اس سے مل جاتے تھے۔ بہرحال، ان خبروں نے بادشاہ کی آتش غضب کو، گویا خجالت کا تیل چھڑک کر، اور بھی بھڑکا دیا اور ستر سال سے زیادہ عمر ہونے کے باوجود اب کے اس نے فوج کی سپہ سالاری خود اپنے ہاتھ میں لی اور نہ درازی سفر کی پروا کی نہ صعوبات راہ کی بلکہ دہلی سے جو چلا تو فیض آباد تک منزل بہ منزل برابر کوچ کرتا چلا آیا اور پھر یہاں چند روز ٹھیر کر جو روانہ ہوا، تو سخت بارشوں کو بھی خاطر میں نہ لایا اور صرف مجبوری سے کہیں کہیں ٹھیرتا ہوا، بہت جلد لکھنوتی پہنچ گیا۔

راستے کے حکام کو تاکیدی فرمان پہنچ چکے تھے اور دریائے گنگا میں باربرداری کے لیے بہت سی کشتیاں تیار تھیں۔ لہٰذا اس لشکر کو، جس میں سپاہی اور بہیر و بنگاہ کے لوگ ملا کر کل دو لاکھ آدمی شمار ہوئے تھے، رسد رسانی کی زحمت اٹھانی نہ پڑی۔ نیز "نمک حرام طغرل" کے فرار ہو جانے کی وجہ سے کوئی مقابلہ پیش نہ آیا اور سلطان کا بلا دقت بلاد بنگالہ پر قبضہ ہو گیا۔ لیکن وہ عہد کر چکا تھا کہ جب تک زندگی ہے اور طغرل ہاتھ نہیں آتا، اس وقت تک اس کا تعاقب نہ چھوڑوں گا۔ چنانچہ لکھنوتی میں نئے حکام مقرر کرنے کے بعد اس نے بلا تاخیر جاج نگر کی جانب، جہاں طغرل بھاگ کر چھپا تھا، کوچ کیا اور اس ملک میں داخل ہوتے ہی ہر طرف سراغ رساں دستے پھیلا دئے کہ جاج نگر کے صحرا و کوہ کا چپہ چپہ چھان ڈالیں۔ آخر کئی مہینے کی تگ و دو اور پیہم جستجو کے بعد فوج ہراول کے ایک دستے کو مفرور باغی کا سراغ مل گیا اور اور چونکہ بادشاہی لشکر کے وہاں آنے تک، اس کے بھاگ جانے کا اندیشہ تھا، لہٰذا یہی چھوٹا سا گروہ جان پر کھیل کر طغرل کی لشکر گاہ میں گھس گیا اور "طغرل، طغرل" پکارتا ہوا اس کے شاہی خیمے تک آ پہنچا۔ یہ ناگہانی شور و غوغا سن کر طغرل کے اوسان جاتے رہے اور وہ بکمال بے حواسی کے عالم میں گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگ رہا تھا کہ تعاقب کرنے والوں میں سے ایک سوار کے تیر نے اسے لشکر گاہ سے کچھ دور

باب

فاصلے پر مار کے گرا دیا اور دوسرے نے پھرتی سے کود کر سر کاٹ لیا اور دامن میں، چھپا کر وہیں ایک ندی کے کنارے منہ ہاتھ دھونے بیٹھ گیا کہ طغرل کے ساتھیوں کو اس واقعے کی اطلاع نہ ہو! کیونکہ یہ چند آدمی اس کے پورے لشکر کا تھوڑی دیر بھی مقابلہ نہ کر سکتے تھے؛

سیاست بلبنی

ادھر زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ شاہی ہراول کی فوج اطلاع پاکر، وہاں آپہنچی اور طغرل کے ساتھیوں میں بہت کم لوگ ایسے تھے جو فرار ہو سکے یا لڑائی میں کام آئے ورنہ سب کے سب گرفتار کر لیے گئے اور بلبن انھیں لیے ہوئے واپس لکھنوتی آیا۔ یہاں پہنچ کر دہلی کے وہ سپاہی یا سردار جو پچھلی لڑائیوں میں طغرل کے ساتھ مل گئے تھے، علیحدہ کر دیے گئے کہ انھیں دہلی پہنچکر سزا دی جائے گی۔ لیکن اہل بنگال میں سے جس شخص نے طغرل کے اعلان خود مختاری کے بعد خفیف سی رفاقت بھی ظاہر کی تھی انھیں بادشاہ نے چن چن کے گرفتار کیا اور سرعام سولی پر لٹکوا دیا! مورخ برنی جس کا دادا اس مہم میں بادشاہ کے ہمرکاب تھا، بیان کرتا ہے کہ لکھنوتی کے بڑے بازار میں دو رویہ سولیاں نصب کر دی گئی تھیں اور کئی دن تک روزانہ صدہا آدمی ان پر چڑھا دئے جاتے تھے[1]، لیکن ہمیں جو بات خاص طور پر یہاں جتانی مقصود تھی، وہ یہ ہے کہ اس سخت سیاست و تادیب کے دوران میں بادشاہ نے اپنے چھوٹے بیٹے **بغرا خاں** (محمود) سے، جسے آیندہ لکھنوتی کا صوبہ دار بنانا منظور تھا، دریافت کیا کہ اے محمود تو نے بھی میری سزا دیکھی؟ جب اس نے عرض کیا کہ "دیکھی"، تو بادشاہ نے فرمایا "بس یاد رکھ کہ ہند و سندھ، گجرات و مالوہ یا لکھنوتی اور سنار گاؤں کا کوئی حاکم جب کبھی، بادشاہ دہلی سے بغاوت کرے گا، تو اس کی اور اس کے عزیز و اقربا اور اعوان و انصار کی یہی سزا ہوگی جو آج طغرل اور اس کے رفقا کی ہوئی ہے!

پھر دہلی روانہ ہوتے وقت بیٹے کو بہت سی نصیحتیں کیں اور کہا کہ اس بات کو نہ بھولنا، کہ بنگالہ میں دوبارہ تسلط قائم کرنے میں مجھے اس قدر جلادی اور فرعونی

[1] برنی۔ صفحہ ۹۲۔

باب ۲

کرنی پڑی ہے، آخر میں چند ہدایتیں، بطور دستور العمل تحریر کرا کے بیٹے کے حوالے کیں جن میں سب سے پہلی ہدایت یہی تھی کہ:۔

"پہلا پند محمود کے باب میں یہ ہے کہ جب اقلیم لکھنوتی اسے ملے تو وہ ہمیشہ بادشاہ دہلی کا فرماں بردار رہے۔ خواہ بادشاہ دہلی کوئی بیگانہ آدمی ہو یا اس کا قریبی رشتہ دار.... کیونکہ لکھنوتی کا ملک کتنے ہی بعید فاصلے پر سہی، مضافات دہلی میں داخل رہتے!"

دوسری فصل:۔ اسلامی علوم اور تمدن ہند میں

بلبن کی وفات

بنگالے کے انتظام سے فارغ ہو کر سلطان ۶۸۱ھ میں دہلی پہنچ گیا تھا۔ اور شہزادۂ محمد کی شہادت، جسے اپنی ترتیب مضامین کے لحاظ سے ہم نے پہلے بیان کیا، اس مراجعت کے تین سال بعد کا واقعہ ہے جس نے ضعیف العمر سلطان کو غم سے نڈھال کر دیا۔ جس قدر اس نے یہ غم دل میں چھپایا اسی قدر وہ اندر ہی اندر گھلتا رہا یہاں تک کہ ۶۸۵ھ (مطابق ۱۲۸۶ء) کے اواخر میں وفات پائی۔

اسلام کی اشاعت

ابھی مسلمانوں کو ہندوستان میں آئے پورے سو برس نہیں گزرے لیکن اب شمالی ہند کا کوئی بڑا قصبہ یا شہر ایسا نہ ہوگا جہاں اسی عرصے میں ان کی تھوڑی بہت آبادی بس جانے کے ساتھ، کم سے کم ایک مسجد اور مدرسہ نہ بن گیا ہو اور ہر چند نو وارد مسلمانوں اور قدامت پسند ہندیوں کے عقائد و تمدن میں زمین آسمان کا فرق تھا، نیز غیر ملکی فاتحین سے طبعی نفرت، باہمی میل جول میں مانع تھی بایں ہمہ یہی زمانہ ہے جس میں اسلامی علوم کی اشاعت نے ہندوؤں کے معتقدات میں انقلاب پیدا کیا اور صدہا آدمی بت پرستی چھوڑ کر مسلمان ہونے لگے۔

انگریز مصنفوں نے اشاعت اسلام کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں

لہ برنی۔ صفحہ ۹۳ و ۹۵ وغیرہ۔

باب ۲

پھیلادی ہیں اور یہ الزام لگایا ہے کہ مسلمان فاتحین ہندوؤں کو جبراً مسلمان کرلیا کرتے تھے۔ حالانکہ اس قسم کا جبر نہ صرف اسلامی تعلیم کے سرتا سر خلاف ہے، بلکہ مذہب کے معاملے میں کبھی اور کہیں بھی کامیاب نہیں ہوا۔ دوسرے ہندوستان کے اس تاریخی مسئلے کے متعلق اگر ہم انگریزی کی سب سے مستند کتاب امپی ریئل گزیٹیر کی ورق گردانی کریں، تو معلوم ہوجائے گا کہ اسے مرتب کرنے والے بھی (غالباً اپنی دلی خواہش کے باوجود) وہ قراین و شواہد نہ پاسکے جن سے مذکورۂ بالا الزام کو کوئی تقویت پہنچتی۔[1] اگرچہ انھوں نے بھی اشاعت اسلام کا وہ صریحی سبب سمجھنے پر کافی توجہ نہیں کی جس پر اہل تحقیق کی سب سے پہلے نظر پڑنی چاہیئے۔ اور وہ یہ کہ ہندو آبادی میں ایسے لوگوں کا آکر بس جانا، جو "اپنے ہاتھ کے تراشے ہوئے پتھروں" کی کوئی وقعت نہ کرتے اور اپنے قول و فعل سے توحید پرستی کی فضیلت ثابت کرتے تھے، ہندوؤں پر بڑا اخلاقی اثر ڈالتا اور انھیں "مورتی پوجا" سے کم از کم بدگمان کردیتا تھا۔

اسلامی تعلیم کے اثرات

بایں ہمہ ہندوستان خاص کے علاقے میں، جہاں ہندو مت یا برہمنی مذہب اچھی طرح دلوں پر قابض تھا، اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد بہت ہی کم تھی، اور یہی ایک واقعہ جبراً اسلام پھیلانے کے غلط الزام کی قطعی تکذیب کرسکتا ہے۔ لیکن یہاں ہمیں خاص طور پر یہ بات جتانی منظور ہے کہ جن راسخ العقیدہ ہندوؤں نے اسلام کو قبول نہیں کیا ان پر بھی اس کی "توحید" اور "مساوات انسانی" کی تعلیم اثر کئے بغیر نہیں رہی اور آیندہ شمالی ہند میں جس قدر مصلحین یا ہندو مت کے نئے فرقے پیدا ہوئے۔ جیسے "رامانندی" "کبیر پنتھی" یا "نانک پنتھی" ان سب نے ویش و کھتری، شودر و برہمن کی تفریق دور کرنے کی کوشش کی اور ایک حد تک

[1] امپی ریئل گزیٹیر کے مرتبین کی تحقیقات کا عام نتیجہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاذ و نادر صورتوں کے سوائے مسلمان فاتحین "غالباً تبدیل مذہب کے لیے بالعموم جبر نہیں کرتے تھے" (دیکھو، جلد اول صفحہ ۴۴۳ جلد دوم صفحہ ۲۵۵ وغیرہ وغیرہ۔ نیز پنجاب میں، جہاں سب سے زیادہ عرصے تک مسلمانوں کی بادشاہی رہی، اشاعت اسلام کے متعلق دیکھو، جلد بستم صفحہ ۲۸۹) نیز ملاحظہ ہو الفنسٹن کی رائے صفحہ ۲۷۶۔

باب ۲

"توحید" کی تعلیم کو بھی قبول کر لیا!

صوفیۂ کرام

یہ اسلامی عقائد، ہندو آبادی میں زیادہ تر مسلمان فقرا یا اولیاء اللہ کے ذریعے پھیلتے تھے جن کی سکون بخش صحبت میں کافر ہو یا مسلمان، ہر شخص کو خدا یاد آجاتا تھا۔ علمائے ظاہر یا مولویوں کو اس زمانے میں نہ اتنی فرصت تھی نہ توجہ کہ وہ غیر مسلم ہندیوں میں اسلام کی ترویج درکنار مبادیٔ خیالات کا بھی کوئی ذریعہ نکالتے۔ لہٰذا یہ کام زیادہ تر مسلمان صوفیوں کے ذریعے ہوا جو شمالی ہند کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے تھے۔ غالباً اسلامی تصوف کو ہندوستان میں جو فروغ اس زمانے میں ہوا، کبھی بعد میں یا اور کسی اسلامی ملک میں نہیں ہوا۔ ملتان و سندھ سے لے کر، جہاں شیخ بہاء الدین ذکریاؒ کی اولاد اور خلفا مصروف ارشاد تھے، لکھنوتی تک صدہا خانقاہیں بنی ہوئی تھیں جن میں ہر طریقے کے مشائخ تزکیۂ نفس اور عشق الٰہی کی تعلیم دیتے تھے۔ خاص پایۂ تخت دہلی میں ان دنوں سلطان نظام الدینؒ کی بابرکت مجلس مرجع انام تھی اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ خاندان چشتیہ میں آپ پہلے بزرگ ہیں جو بداؤں یعنی ہندوستان خاص کے علاقے میں پیدا ہوئے اور اس لئے خالص ہندوستانی تھے۔

علوم ظاہری اور فنون

ان خانقاہ نشینوں کی خدمت و رہنمائی کے علاوہ مسلمان ارباب حکومت علوم ظاہری کی تعلیم کا نہایت فیاضی سے انتظام کرتے تھے اور ہر طالب علم بغیر کسی خرچ کا بار اٹھائے، جہاں تک اس کا شوق مساعدت کرے تعلیم حاصل کر سکتا تھا درس گاہ کا کام بالعموم مسجدوں سے لیا جاتا تھا اور بڑے بڑے مقامات پر مساجد سے متصل پردیسی طلبہ کے رہنے کے مکانات ہوتے تھے۔ ان عمارات کے قیام اور مدرسین و طلبہ کے ضروری مصارف بادشاہ یا شہر کے روسا کے ذمے ہوتے اور اکثر بڑی بڑی جاگیریں اسی غرض سے وقف کر دی جاتی تھیں کہ ان کی آمدنی مذکورۂ بالا مصارف کی کفیل ہو، تعلیم کی ایک اور صورت یہ تھی کہ ذی ثروت امرا اپنی اولاد کے واسطے معلمین کو گھر پر ملازم رکھ لیتے اور ان کے لڑکوں کے ساتھ خاندان یا محلے کے اور لڑکے بھی شریک درس ہو جاتے تھے؛ لیکن یہاں اس اہم فرق کو خاص طور پر یاد رکھنا چاہئے کہ اس زمانے میں تعلیم کی غرض و غایت یہ تھی کہ

باب ۲

آدمی عمدہ اخلاق و عادات سیکھے اور چونکہ مسلمانوں کے نزدیک ان کا سب سے مکمل نمونہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کبار رضوان اللہ علیہم ہی کی سیرت ہوسکتی ہے لہذا نصاب تعلیم میں زیادہ تر کتب دینیہ شامل تھیں اور اس قسم کے علوم وفنون جن سے معاش حاصل کرنا مقصود ہو، پیشہ ور لوگ اپنی اولاد یا شاگردوں کو بطور خود سکھاتے تھے۔ اس کلیے سے فنون سپہ گری ایک حد تک مستثنیٰ رہیں۔ مسلمان فاتحین کا عام پیشہ ہی سپہ گری تھی اور اس لیے ان کی فوجوں یا چھاؤنیوں میں ہمیشہ ایک بڑی تعداد اس قسم کے فن سیکھنے اور سکھانے میں مصروف رہتی تھی۔

سپہ گری اور سپہ سالاری کے فن میں ہندوستان کے مسلمانوں نے جو دستگاہ حاصل کی شاید اس کا بہترین ثبوت تو یہ ہے کہ قبائل مغل تک ان کا لوہا ماننے لگے تھے[۱] لیکن اسلامی علوم کی مہارت میں بھی یہاں کے بس جانے والے دوسرے ملکوں سے کچھ بہت پیچھے نہ تھے۔ مختلف کتابوں میں مورخین، شعرا اور ادیبوں کے علاوہ بہت سے ہندی علما کا نام ملتا ہے جنھوں نے تفسیر و فقہ میں بلند پایہ کتابیں تصنیف کی تھیں اور گو اس موضوع پر یہاں تفصیل سے لکھنے کی گنجائش نہیں، تاہم امام رضی الدین حسن بن محمد صغانی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے جن کے علم و فضل کو علمائے حجاز و عراق تک نے تسلیم کیا۔ وہ سلطان نظام الدین کی طرح بداؤں میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی۔ پھر کچھ عرصے تک کول (علی گڑھ) کے سرکاری دفتر میں "نائب مشرف" (یعنی سررشتہ دار) کے عہدے پر رہے اور یہیں سے بغداد جا کر علم حدیث کی تکمیل کی۔ ان کی تالیف "مشارق الانوار" حدیث کی نہایت مشہور و معتبر کتاب مانی جاتی ہے اور اس کی قبولیت کا اس ایک واقعے سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ سولھویں صدی عیسوی تک (یعنی تقریباً ساڑھے تین سو برس میں) اس کتاب کی ۲۴، ۲۵ شرحیں اور حواشی ایسے لکھے جا چکے تھے جو بجائے خود

امام صغانی

[۱] اس بارے میں ملاحظہ ہو طبقات ناصری صفحات ۳۱۷ وغیرہ جن میں مغل سفیروں کے دہلی آنے اور مرعوب ہونے کا بہ تفصیل ذکر کیا ہے۔ نیز دیکھو برنی صفحہ ۵۵ وغیرہ۔

باب ۲

مستقل اور بلند پایہ کتابیں ہیں! امام صاحب موصوف کی اور بھی کئی کتابیں ہیں۔ انھوں نے سنہ ۶۵۰ھ/۱۲۵۲ء میں وفات پائی[۵۱]۔

علما کی تعلیم اور عدالتی مناصب

مشایخین و علما کی تعلیم اور خدمت گزاری کو ادنیٰ و اعلیٰ ہر قسم کے مسلمان اپنی سعادت جانتے تھے اور سرکاری طور پر بھی امرا اور وزرا سے قضاۃ کا مرتبہ اونچا ہوتا تھا[۵۲]۔ مگر ان قاضیوں کے بھی امرا اور دیگر عہدہ داروں کی طرح، مختلف درجے تھے۔ یوں تو ہر بستی یا چھاونی میں ایک دو قاضی مقرر کیئے جاتے تھے کہ مسلمانوں کے باہمی تنازعات کا تصفیہ کریں، لیکن پائے تخت دہلی اور لشکر شاہی کے قاضی مرتبے میں سب سے بڑے سمجھے جاتے تھے اور ان سب پر ایک **قاضی ممالک** یا **صدر الصدور** یا **شیخ الاسلام** ہوتا تھا جو تمام عدالتی انتظامات کا ذمہ دار ہوتا اور مختلف مقامات پر قاضیوں کا تقرر اور مقدمات کا مرافعہ اور آخری فیصلہ کرتا تھا۔ فیصلے بالعموم فقہ حنفی کے مطابق کیئے جاتے تھے۔

پنچایتیں۔

ہندوؤں کو عدالتی یا قانونی معاملات میں بالکل آزادی حاصل تھی اور ان کے دیوانی اور فوجداری مقدمات کا فیصلہ خود ان کی منتخب کردہ دیہی یا قومی پنچایتوں میں ہوتا تھا اور ان فیصلوں کے نفاذ کے لیے ضرورت کے وقت سرکار ان کی اعانت کرتی تھی۔

کوتوال اور شحنہ

بڑے بڑے شہروں میں تھوڑے سے انتظامی اختیارات کوتوال شہر کو بھی

۵۱۔ امام صغانی رح کے حالات اور تصانیف کا مآثر الکرام میں ذکر موجود ہے (صفحہ ۱۸۰) اور اس میں انھیں غلطی سے "لاہوری" لکھدیا ہے۔ لیکن سب سے واضح اور معتبر حالات وہ ہیں جنھیں سلطان نظام الدینؒ کی زبانی صاحب فوائد الفواد نے نقل کیا ہے (صفحات ۱۰۲ تا ۱۰۵) قدیم حواشی اور شروح کے لیے دیکھو کشف الظنون جلد اول صفحہ ۴۳۶۔ "مشارق الانوار" کا ایک محشی ترجمہ اردو میں چھپ چکا ہے لیکن مترجم کو یہ معلوم نہیں تھا کہ صاحب کتاب اصل میں ہندوستان کے آدمی ہیں۔

۵۲۔ صاحب طبقات اور ضیاء الدین برنی نے جہاں بادشاہوں کے بڑے عہدہ دار اور امرا کی فہرست درج کی ہے وہاں بادشاہ وقت کے بعد شہزادوں سے بھی پہلے "قضاۃ" کے نام لکھے ہیں اور یہی باعتبار مراتب اس عہد کا درباری آئین معلوم ہوتا ہے۔ (دیکھو طبقات صفحہ ۱۲۵ و ۱۷۷؛ برنی ۲۴ و ۱۲۶ وغیرہ)

باب

دے دئے جاتے تھے جس کے ماتحت نیم فوجی پولیس کی معقول جمعیت ہوتی تھی۔ ان اختیارات کی بنا پر اگر ہم اس زمانے کی اصطلاح میں کوتوال کو "پولس میجسٹریٹ" کہیں تو بیجا نہ ہوگا لیکن اس میں شک نہیں معلوم ہوتا کہ تمام اہم فوجداری مقدمات اس کو قاضی کی عدالت میں پیش کرنے پڑتے تھے اور قاضی کے فیصلے کے بغیر وہ بطور خود کوئی سزا مجرم کو نہ دے سکتا تھا۔

شحنہ کی اصطلاح اس زمانے میں ایک خاص معنی میں مستعمل تھی، جسے میجر راورٹی انگریزی میں "سپرنٹنڈنٹ" کے لفظ سے ترجمہ کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک دور جدید کی زبان میں اسے ڈپٹی کلکٹر یا افسر مال کہنا چاہئے جو گاؤں کے پٹیل پٹواری کی معرفت سرکاری مالگزاری وصول کرتا اور مال کے مقدمات بھی فیصل کرتا تھا۔ مگر دیوانی یا فوجداری مقدمات میں اس کا کچھ دخل نہ تھا اور یہ مقدمے صرف قاضی کی عدالت یا پنچایت ہی چکا سکتی تھی۔

صوبہ دار وغیرہ

کوتوال و شحنہ پر ہی منحصر نہیں، بلکہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں کوئی انتظامی عہدہ دار عدالتی معاملات میں دخل و اختیار نہیں رکھتا تھا، اور یہ وہ قدرتی اور واجبی تقسیم اختیارات ہے جس کے واسطے آج کل اہل ہند انگریزی حکومت سے مطالبہ کر رہے ہیں، مگر مسلمانوں کے عہد حکومت میں صوبے کا سب سے بڑا انتظامی عہدہ دار بھی بالعموم قاضی کا فیصلہ رد نہیں کر سکتا تھا۔

یہ عہدہ داران دونوں مقطع یعنی "صاحب اقطاع" کہلاتے اور صوبے کی بجائے بھی "اقطاع" کا لفظ مروج تھا۔ ان مقطع یا صوبہ داروں کے اختیارات و مرتبے میں فرق ہوتا تھا اور اس کا سبب ان کی ذاتی وجاہت اور نیز اقطاعات کی مختلف حیثیت ہوتی تھی کیونکہ پائے تخت دہلی سے دور، سرحدوں کے اقطاع[1]

[1] مثلاً بنگالے میں اگرچہ دریائے گنگا کے شمال اور جنوب میں دو علیٰحدہ صوبے تھے، مگر بالعموم ان کا صوبہ دار یا مقطع ایک ہی شخص ہوتا، جس کا مستقر (اور اس لئے صوبے کا نام بھی) لکھنوتی تھا، اسی طرح ملتان و اُچھ کے دو بڑے اقطاع شہزادہ محمد کی حکومت کے زمانے میں ملا دئے گئے تھے۔ سرحد راجپوتانہ کے مشہور اقطاع ناگور، منڈور، اجمیر اور سانبھر، پائے تخت سے قریب ہونے کی

باب ۲

بالعموم رقبے میں بہت وسیع تھے اور ان کے حاکموں کو بھی اندرونی نظم ونسق کے علاوہ اپنی ذمہ داری پر بیرونی جنگ تک کا اختیار دے دیا جاتا تھا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں مرکزی حکومت کو وقتی اور مقامی ضروریات سمجھانے اور کسی کام کی منظوری حاصل کرنے میں بہت دیر لگتی تھی؛ غرض بڑے اقطاعات کے حاکموں کا مرتبہ بڑا اور اختیارات زیادہ ہوتے تھے اور اسی طرح بادشاہ بطور خاص اپنے کسی عزیز کو چھوٹے اقطاعات میں بھی زیادہ اختیارات دے سکتا تھا؛ مقطع کے ماتحت چھوٹے شہروں میں یا براہ راست بادشاہ کے حکم سے اضلاع اور پرگنوں میں جو انتظامی حاکم مقرر ہوتے تھے، وہ "خواجہ" اور "متصرف" کہلاتے تھے[۱]۔

خطبہ و سکہ[۲] کے سوا جو ہمیشہ بادشاہ دہلی کے نام کا رائج ہوتا تھا۔ بعض صوبہ دار اپنی اپنی جگہ پر نیم خودمختار بادشاہ ہوتے تھے۔ لیکن مرکزی حکومت خراج کی مقررہ رقم اور فوجی امداد لینے کے علاوہ، ان سے انتظامی معاملات میں بھی بازپرس کر سکتی تھی۔ چونکہ خود صوبہ داروں کی آئندہ ترقی اور ذاتی اقتدار ہی اپنے صوبے کی خوشحالی پر منحصر ہوتا تھا، لہذا وہ رعایا کو خوش کرنے اور آبادی بڑھانے کی کوشش کرتے رہتے تھے اور تاریخ میں اکثر مسلمان صوبہ داروں کی مثالیں ملتی ہیں جنھوں نے عمدہ نظم ونسق کے ساتھ ملک میں بہت سے نئے شہر بنائے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ وجہ سے رقبے میں بڑے نہ تھے لیکن یہاں کے صوبہ دار بھی اکثر نہایت معزز اور ذی اختیار ہوتے تھے۔ مالوے کے اقطاعات میں تھنگر (بیانہ) اور گوالیار کا جا بجا ذکر آتا ہے؛ پنجاب میں پہلے لاہور اور بعد میں دیپالپور، بھٹنڈہ، سمانہ، کہرام اور ہانسی مشہور اقطاع تھے۔ اور پایۂ تخت دہلی کے قریب اول اول مسلمان آبادی کا بڑا مرکز ہونے کے سبب سے اقطاع بداؤں کی خاص وقعت ومنزلت تھی؛

[۱] برنی صفحہ ۳۶ و ۳۰۸۔

[۲] جہاں تک تاریخی شہادت کا تعلق ہے، تمام شمالی ہند میں ایک سکہ سب سے پہلے سلطان معزالدین سام ہی کے زمانے میں جاری ہوا۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے بنگالے کے بعض اضلاع میں اس سے پہلے دھات کا کوئی سکہ رائج ہی نہیں ہوا تھا۔ (دیکھو طبقات ناصری صفحہ ۱۴۹ و ۱۵۱۔ کرانکلز آف دی پٹھان کنگز صفحہ ۱۱)

باب ۴

ویران علاقے آباد کئے۔ اور دشوار گزار جنگلوں کو کاٹ کر اور ان علاقوں میں جو کثرت بارش سے ہفتوں زیر آب رہتے تھے، مضبوط و بلند پشتے بنا کر[1] نئے راستے نکالے تاکہ تجارت اور آمد و رفت میں سہولتیں پیدا ہوں اور صوبے کی خوش حالی ترقی پائے۔

اسی کارگزاری پر صوبہ دار کی شہرت اور آیندہ ترقی منحصر تھی۔ صدر حکومت کو اس کے عزل و نصب کا اختیار تھا اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا، وہ ہر وقت اس کے کاموں پر نظر رکھتی تھی۔ صوبہ دار کا سب سے بڑا فرض یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ ملک میں فتنہ و فساد نہ ہونے دے اور گو خشک سالی یا دیگر مشکلات کی وجہ سے رقوم خراج یا جزیہ کی عدم ادائی، نیز فوج کا بروقت مہیا نہ ہو سکنا، معمولی تحقیقات کے بعد معاف کر دیا جاتا تھا لیکن ایک خطا ایسی تھی جس میں صدر حکومت نہایت سخت گیری سے کام لیتی تھی۔ وہ یہ کہ مظلوم اور کمزور کی دادرسی میں قصور کیا جائے یا خود صوبہ دار کسی رعایت یا اشتعال کی وجہ سے ناانصافی کر گزرے۔ ایسی صورت میں صوبہ دار پر بادشاہ کا سخت عتاب ہوتا اور اگر خود صوبہ دار نے کوئی ظلم کیا ہے تو بلا رو رعایت عام مجرموں کی طرح اس کو سزا دی جاتی تھی۔

ڈاک کا انتظام

صوبہ داروں پر نگرانی اور حالات کی اطلاع دینے کے لیے ہر اقطاع میں ایک بادشاہی عہدہ دار مقرر تھا جسے برید یعنی ڈاک کا عہدہ دار کہتے تھے اور ان سب کا اعلیٰ عہدہ دار برید ممالک کہلاتا اور خاص پائے تخت میں اس کا دفتر ہوتا تھا۔ ڈاک کے مقررہ وقت باقاعدہ پہنچنے پر خاص توجہ کی جاتی تھی اور کم سے کم

---

[1] اس قسم کے بلند راستے بنانے کی ضرورت بنگالے میں پڑتی تھی جہاں برسات میں پانی کی وجہ سے راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔ مسلمان حکام نے بیسیوں میل لمبے متعدد سنگین پشتے تیار کرا کے اس خرابی کو دور کر دیا تھا اور بعض پشتوں کے آثار اب تک موجود ہیں۔ اسلامی حکومت کے ابتدائی سنین میں ان پشتوں کی تعمیر کے متعلق دیکھو طبقات ناصری صفحہ ۱۶۲۔ اور آثار قدیمہ کی جدید تحقیقات کا خلاصہ راورٹی نے اپنے حواشی میں لکھا ہے۔ (صفحہ ۵۸۶)۔

باب ۲

بلبن کے عہد میں یہ محکمہ اس قدر منتظم حالت میں تھا کہ بنگالے اور جاج نگر پر فوج کشی کے زمانے میں بھی اس نے حکم دیا تھا کہ دہلی کی ڈاک ہر ہفتے میں تین چار مرتبہ لشکرگاہ شاہی میں پہنچ جایا کرے[۱]۔ اسی بادشاہی ڈاک کے ساتھ اور لوگ بھی اپنے خطوط روانہ کر سکتے تھے۔ امراء، صوبہ دار اور بڑے بڑے تاجروں کے ہرکارے ہر سمت میں الگ دوڑتے رہتے تھے اور اس زمانے کی تاریخیں نیز بعض مکتوبات کے مجموعے، دیکھ کر یہ رائے قائم کرنا کچھ بے بنیاد نہیں ہے کہ ہندوستان کے اندرونی علاقوں میں لوگ خاصی طرح خط و کتابت کرتے اور کر سکتے تھے۔

راستے اور ذرائع سفر

لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں جب کہ ریل تو ایک طرف پکی سڑکیں بھی نہ تھیں، راستہ طے کرنے میں بہت دیر لگتی تھی۔ کچے راستوں میں بھاری بیل گاڑیوں کے سوا اور کسی قسم کی گاڑی نہ چل سکتی تھی۔ پالکی، سنگھاسن یا ہوادار، پُرتکلف امیرانہ سواریاں تھیں۔ لیکن اس زمانے میں ایسے دوردم اونٹ اور گھوڑے خاص طور پر بکثرت پائے جاتے تھے جو ایک دن میں سو میل کی منزل طے کرتے تھے[۲] اور بعض سپہ سالاروں کی (سوار) فوج سمیت ۶۰، ۷۰ میل روزانہ طے کرنے کی بھی مثالیں ملتی ہیں[۳]۔ بایں ہمہ فوج کی بڑی منزل، جبکہ لمبا سفر کرنا ہو ۲۴، ۲۵ میل سے زیادہ نہ ہوتی تھی اور عام مسافر یا تجارتی قافلے اس سے بھی آہستہ چل کر راستہ طے کرتے تھے۔

تجارت اور صناعات

آمد و رفت اور تجارتی یا فوجی سامان لے جانے کے لیے جہاں کہیں دریا تھے، وہاں کشتیوں سے کام لیا جاتا تھا۔ خاص کر دریائے سندھ میں بہت سی تجارتی کشتیاں بیرونی ممالک کا تجارتی مال اندر اور پنجاب و سندھ کی دساور، سندھ کی بندرگاہوں تک لاتی اور لے جاتی تھیں۔ اور پہلے باب میں جغرافیۂ ادریسی کے حوالے سے اجمالاً ہم بیان کر چکے ہیں کہ ان بندرگاہوں سے چین، جزائر ہند چینی

---

[۱] برنی صفحہ ۸۰۔ نیز ڈاک کے انتظام کے متعلق دیکھو سفرنامہ ابن بطوطہ (اردو ترجمہ) ترجمہ ۸۲۔

[۲] طبقات ناصری۔ صفحہ ۳۲۳۔ راورٹی صفحات ۸۱۰ و ۸۶۴ وغیرہ

[۳] " " " ۳۲۳۔

ا سلہ

کے اواخر میں پہلی مرتبہ آباد ہوی یا دہلی کہلائی[1] اور پانچویں صدی ہجری (یا گیارھویں صدی عیسوی) کے وسط میں اس ریاست کی راج دھانی بنی جس کی حدود ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اسلامی فتح کے وقت یہاں سنگ سرخ کا ایک مضبوط قلعہ تھا۔ لیکن پرتھی راج کے ورثے میں آنے کی وجہ سے دہلی ریاست اجمیر کی تابع بن گئی اور اس طرح اس کی سیاسی منزلت گھٹی تو گمان ہوتا ہے کہ آبادی بھی گھٹ گئی ہوگی۔ مگر سلمان فاتح، شمالی ہند میں جو نئی سلطنت قائم کر رہے تھے اس کے واسطے دہلی سے بہتر صدر مقام کوئی نہ ہو سکتا تھا۔ اول تو وہ سندھ و پنجاب اور موجودہ آگرہ و اودھ کے عین وسط میں واقع ہے دوسرے یہاں سے راجپوتانے کے جنگجو قبائل پر ہر وقت نظر رکھی جا سکتی تھی۔ تیسرے لب جمنا اور نیز گنگا کے قریب واقع ہونے کے باعث یہاں سے ممالک بنگالہ تک فوج کشی کرنا سہل ہو گیا تھا کیونکہ یہ دریا کشتی رانی کے واسطے نہایت موزوں ہیں۔

شہر کی آبادی

غرض ہندوستان کے نئے بادشاہوں نے اسی شہر کو اپنی تخت گاہ قرار دیا اور ایک صدی کے اندر، راج پوت زمینداروں کی یہ چھوٹی سی بستی، اتنا بڑا شہر بن گئی کہ آج کل، نئی دہلی یا شاہجہاں آباد کو چھوڑ کر اس کے پرانے کھنڈر بھی تقریباً پینتالیس مربع میل کے رقبے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بے شبہ ان میں سے اکثر کھنڈر ان عمارتوں کے ہیں جو عہد بلبن کے بعد تعمیر ہوئی تھیں لیکن شہر کی وسعت و عظمت کی بنیاد سلطان شمس الدین ہی کے زمانے میں پڑ چکی تھی اور فتنۂ مغول کے بھاگے ہوئے لوگ انہی ایام میں بلاد ہند، خاص کر دہلی، میں آ کر بسے تھے۔ بغداد تباہ ہوا (۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء) تو وہاں کے علماء امرا اور دو عباسی شہزادے بھی یہیں آ کر پناہ گزیں ہوئے۔ فرشتہ کی روایت کے بموجب ایسے پندرہ شہزادے، جن کے خاندان میں چند سال قبل تک حکومت و بادشاہی تھی، دربار بلبنی کی زینت بڑھاتے تھے اور دہلی میں ہر ایک کے نام پر علیحدہ علیحدہ محلے آباد ہو گئے تھے[2]۔ یہ محلے

---

[1] ارلی ہسٹری صفحات ۳۸۴، ۳۸۶، گزیٹیر جلد گیارہ صفحہ ۲۳۴

[2] تاریخ فرشتہ (صفحہ ۷۰) جس میں ان پندرہ محلوں کو نام بنام درج کیا ہے۔

بجائے خود چھوٹے چھوٹے قلعے ہوتے تھے جن میں پیادہ و سوار کی معقول جمعیت کے علاوہ شاگرد پیشہ، تجار، اور اہل حرفہ کی کافی تعداد رہتی تھی۔

اس زمانے میں مردم شماری کا دستور نہ تھا اور ہم شہر کی کل آبادی کا اندازہ صرف ان سپاہیوں کی تعداد سے کر سکتے ہیں جنھوں نے دہلی کو اپنا وطن بنا لیا تھا اور جو شہر کی مردانہ آبادی کا عنصر غالب تھے۔ کیونکہ درحقیقت اکثر اسلامی شہروں کی نوعیت ہی فوجی چھاؤنیوں کی سی تھی جن میں سپاہی اپنے اور اپنے متعلقین کے لیے مکانات بنا کر مستقل سکونت اختیار کر لیتے تھے۔ اور سلطان ناصر الدین محمود ہی کے زمانے میں اس فوج کی تعداد جو دہلی اور حوالیِ شہر میں تھی دو لاکھ پیادہ اور پچاس ہزار سوار گنی گئی تھی۔[۱] اس قول کی تصدیق نیز اس بات کا ثبوت کہ اس تعداد میں آیندہ مزید اضافہ ہوتا رہا، یہ ہے کہ علاء الدین خلجی کے عہد میں فقط سوار فوج کا شمار تین لاکھ تک پہنچ گیا تھا۔[۲] اور اگر سب نہیں تو اس فوج کا حصہ اعظم یقیناً خاص دہلی میں سکونت گزیں تھا۔ اب قیاس کرنا چاہیئے کہ اتنی کثیر سپاہ کے اہل و عیال، متعلقین ملازمین اور ان کی ضروریاتِ تمدن پوری کرنے والے اہل حرفہ، مزدور اور تاجر، بنئے بقال کتنے ہوں گے؟ اور تمام قرائن کو ملحوظ رکھ کر امید ہے ہمارا یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ سمجھا جائے گا کہ عہد بلبن میں دہلی اور حوالیِ دہلی کی کل آبادی کم سے کم پانچ اور سات لاکھ کے درمیان تھی! گویا عظمت رفتہ کے مرثیہ خواں شاعر، حالی کا یہ شعر نہ صرف بعد کی دہلی یا شاہجہان آباد پر بلکہ ساتویں صدی (ہجری) کی دہلی پر بھی بخوبی صادق آتا تھا کہ:-

زیب دیتا تھا لقب تجھ کو "جہاں آباد" کا
نام روشن تجھ سے تھا غرناطہ و بغداد کا![۳]

---

[۱] طبقات ناصری صفحہ ۳۱۷ - راورٹی صفحہ ۸۵۶ -

[۲] فرشتہ ہمیں یقین دلاتا ہے کہ مغلوں سے جب شہر کے قریب مقابلہ ہوا تو علاء الدین "بر روایت صحیح پانسد لک سوار و دو ہزار و ہفت صد فیل" مقابلے کے لیے نکلا تھا۔ ضمناً ضیاء الدین برنی کے اقوال سے بھی اس تخمینۂ فوج کی تصدیق ہوتی ہے۔ دیکھو صفحہ ۲۶۲ و ۲۶۷ -

[۳] یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ شہر بغداد کی کل آبادی کا شمار اس کے عروج (یعنی تیسری صدی ہجری کے اوائل

باب ۲

دوسرے بڑے شہر

بالعموم ایشیائی ممالک میں صرف دارالسلطنت ہی بڑا اور آباد شہر ہوتا ہے۔ سلطنت دہلی کے متعلق بھی یہ خیال اس حد تک صحیح ہے کہ ان دنوں شمالی ہند میں اور کوئی شہر آبادی میں اس کے برابر ہونا تو درکنار آدھا بھی نہ تھا، تاہم مختلف شواہد پر بہ احتیاط غور کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ کم سے کم تین شہر ایسے موجود تھے جنھیں زمانۂ جدید کے معیار آبادی کی رو سے بھی "بڑے شہر" کہا جا سکتا ہے۔ یہ ملتان، لاہور (تباہی سے قبل) اور لکھنوتی تھے جن میں سے آخر الذکر کی آبادی کچھ عرصے بعد بڑھتے بڑھتے خود دہلی کے برابر ہو گئی تھی[1] دوسرے درجے کے آباد و بارونق شہر بہار، بنارس، کڑاہ، فیض آباد (اودھ)، بداؤں، اجمیر، ناگور، ہانسی، بھٹنڈہ، کہرام، سمانہ، دیپالپور، اُچھ، بھکر، اور دیبل مانے جاتے تھے اور ان میں سے اکثر بڑے بڑے اقطاع کا (جنھیں اس زمانے کی قسمت یا کمشنریوں کے برابر سمجھنا چاہئے) مستقر تھے۔

محاصلِ سلطنت

تمام سلطنت کی آبادی کا اندازہ کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی قابل اطمینان ذریعہ نہیں لیکن اس بارے میں اگر ہم کچھ قیاس دوڑا سکتے ہیں تو محاصل سلطنت کا تخمینہ کرنے کے بعد جن کی صحیح میزان صرف تاریخ فیروز شاہی[2] میں ملتی ہے۔ اور وہ صحت و تحقیق کے ساتھ ہمیں بتاتی ہے کہ فیروز تغلق کے زمانے میں محاصل سلطنت کی کل میزان ۶ کروڑ ۸۵ لاکھ تنکہ تھی[3] تنکہ یا تنگہ (بمعنی "سفید") ترکی زبان کا لفظ ہے اور ان دنوں ہندوستان کا روپیہ، یعنی ایک تولہ چاندی کا سکہ اسی نام سے مروج تھا سونے کی اشرفی کو بھی تنکۂ زر یا تنکۂ سرخ کہتے تھے مگر زیادہ رواج اسی نقرئی تنکے اور تانبے کے چیتل یا جیتل کا تھا جسے اس زمانے کے ادھنّے کا ہم سنگ سمجھنا چاہئے۔ ایک تنکے کے ۶۴ جیتل اور ایک جیتل کے ۴ فلوس (یعنی دھیلے یا

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ کے زمانے میں بیس لاکھ مانا جاتا تھا (انسائی کلو: جلد سوم صفحہ ۱۹۸)

[1] راورٹی حاشیہ صفحہ ۵۸۲۔ (پرتگیز مصنفین کے حوالے سے۔

[2] یہ تاریخ جسے سلطان فیروز شاہ تغلق کے ایک درباری شمس سراج عفیف نے لکھا تھا ضیاء الدین برنی کی کتاب کی طرح تاریخ فیروز شاہی کے نام سے موسوم ہے اور چونکہ اس میں صرف بادشاہ موصوف کے حالات درج ہیں، لہٰذا ہم اس تاریخ کو اسی نام سے یاد کریں گے اور برنی کی کتاب کو محض تاریخ برنی کہیں گے تاکہ ان دونوں میں بہ آسانی امتیاز ہو سکے۔

[3] تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۹۴

باب

چھوٹے پیسے) ہوتے تھے؛ اول اول چاندی کا ایک اور سکہ دہلی وال بھی بنایا جاتا تھا جس میں تانبے کی ملونی ہوتی تھی لیکن سندھ و پنجاب کے سوا، ہندوستان خاص کے علاقوں میں اس کا زیادہ رواج نہیں ہوا۔ البتہ بعد میں، خاص کر جدت طراز محمد تغلق کے عہد میں، اور کئی سکے چلنے لگے تھے جن میں دوگانی (= دو جیتل) اور چہارگانی (= چار جیتل) قابل ذکر ہیں[1]۔

الغرض جیسا کہ ہم بیان کر رہے تھے، عہد فیروز شاہ تغلق میں محاصل سلطنت کی میزان پونے سات کروڑ تنکہ تھی اور اس وقت نہ صرف دکن بلکہ بہار و بنگال کے زرخیز صوبے، سلطنت کی حدود سے خارج اور خود مختار ہو گئے تھے۔ اس سے پہلے سلاطین کے محاصل کی کوئی صحیح میزان ہمیں نہیں ملی۔ صاحب طبقات ناصری نے ایک جگہ سلطان شمس الدین کی داد و دہش کی تعریف میں لکھا ہے کہ وہ "علمائے با نام و سادات کرام و ملوک و امرا و صدور و کبرا" کو "زیادت از ہزار لک" (یعنی دس کرور) ہر سال عطا کیا کرتا تھا[2]۔ دیگر قرائن سے بھی ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ زیر نظر عہد میں ممالک ہند کی کل سالانہ آمدنی کم و بیش دس کروڑ تھی اور اسی میں ان تمام اقطاعات اور جاگیرات و اوقاف کے تخمینی محاصل شامل ہیں جنھیں خزانۂ شاہی کی بجائے صاحبان اقطاع و جاگیرات وصول کر لیتے تھے۔

روپے کی قیمت خرید

اس دس کروڑ تنکہ محاصل کا اگر موجودہ محاصل سے مقابلہ کیا جائے تو ظاہرا بہت بڑا فرق نظر آئے گا۔ چنانچہ شمالی ہند کے چار بڑے صوبوں کی مقامی (لوکل) اور شاہی (امپی ریل) محاصل کی کل میزان ۱۹۱۶ء میں تقریباً پینتالیس کروڑ روپیہ تھی

---

[1] ہندوستان کے قدیم اسلامی سکوں کے ٹھیک وزن و قیمت کے متعلق ہماری معلومات یقینی نہیں۔ ہم عصر فارسی تاریخوں میں اس بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ بہت مختصر اور کہیں کہیں متناقض ہے۔ حال میں اڈورڈ ٹامس نے ان کی تحقیقات میں بڑی محنت اور قابلیت سے چند مضامین اور کتابیں لکھی ہیں لیکن اس کے نتائج بھی ہر جگہ قابل تسلیم نہیں معلوم ہوتے۔ مذکورۂ بالا بحث کے متعلق ملاحظہ ہو اس کی کتاب "کرانکلز آف دی پٹھان کنگز" (صفحات ۴۹، ۱۱۶، ۲۱۹، وغیرہ) نیز دیکھو راورٹی حواشی صفحہ ۵۸۴؛ الیٹ جلد دوم حاشیہ صفحہ ۲۴۲۔

[2] صفحہ ۱۶۶۔

باب ۲

لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ اس زمانے کے ایک تولہ چاندی کے تنکے اور آج کل کے روپے کی قیمت خرید میں بڑا بل تھا۔ سلطان علاء الدین خلجی کے عہد میں اجناس کے جو نرخ سرکاری طور پر مقرر و مروّج تھے ان سے اُس عہد کی ارزانی کا پتا چلتا ہے کہ ایک تنکے کے (موجودہ اوزان کے حساب سے) ڈھائی من گیہوں بکتے تھے اور جو، چنا، موٹھ، ماش وغیرہ اجناس اس سے بھی زیادہ سستی تھیں؛ مصری کچھ کم آٹھ سیر، سفید شکر بارہ سیر اور سرخ شکر چھتیس سیر فی تنکہ فروخت ہوتی تھی۔ اسی طرح باریک و نرم گاڑھے ("کرپاس") کا بیس گز کا تھان ایک تنکہ میں، اور عمدہ مہین سکمہ ("شیریں بافت") کا غالباً اسی قدر بڑا تھان پانچ تنکہ میں اور معمولی تین تنکہ میں مل جاتا تھا۔[1] غرض مجموعی طور پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قیمت خرید کے اعتبار سے آجکل کے کوئی بارہ روپے اس زمانے کے ایک تنکہ کے برابر ہوئے۔

آبادی اور عام خوشحالی

القصہ فیروز شاہ کے محاصل ہی کو پیش نظر رکھ کر اگر ہم اس ایک گاؤں کی آمدنی (تیس ہزار جیتل) کو جو صاحب طبقات ناصری کو ملا تھا۔[2] اوسط قرار دیں تو تمام شمالی ہند میں کل دیہات کی تعداد کا اندازہ ایک لاکھ سے اوپر ہوگا اور تاریخ فیروز شاہی کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان علاء الدین کے عہد میں ایک گاؤں کی آبادی ذکور کا تخمینہ ۲ سو تا ۳ سو فرد کیا جاتا تھا۔[3] لہٰذا ہم ایک گاؤں کی کل آبادی بالا وسط چار سو قرار دیں تو کچھ بیجا نہ ہوگا اور اس حساب سے کل شمالی ہند کی مردم شماری کا تخمینہ چار کروڑ کے قریب ہوتا ہے جو گویا آج کل کی (چودہ کروڑ) آبادی سے کچھ کم یک ثلث تھی؛ ظاہر ہے کہ یہ سب ظنّی اعداد ہیں، البتہ ایک بات، جس کے ثبوت میں

۱۔ نرخ اجناس کے متعلق دیکھو برنی صفحہ ۳۰۵ و ۳۱۰۔ اوزان کے تعین میں ہم نے فرشتہ کی پیروی کی ہے جس نے اپنے زمانے میں قدیم تر اوزان کی تحقیق کی تھی۔ دیکھو صفحہ ۱۱۰ و ۱۱۴۔ واضح رہے کہ سیر اس زمانے میں ۲۴ تولے کا ہوتا تھا اور اس حساب سے چالیس سیر کا من، ہمارے ۱۲ سیر کے برابر ہوا۔ لیکن اوپر جو نرخ لکھے ہیں وہ موجودہ اوزان کے حساب سے ۸۰ تولے کا سیر بنا کر لکھے گئے ہیں۔

۲۔ طبقات۔ صفحہ ۲۹۵۔

۳۔ تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۹۵۔

۱ب۲

بہت سے قوی قرائن اور تحریری شواہد پیش کیے جا سکتے ہیں، یقینی نظر آتی ہے۔ اور وہ یہ کہ گو اس وقت کا تمدن سادہ اور اس زمانے کے مقابلے میں دیہقانی قسم کا تھا، بایں ہمہ متوسط اور ادنیٰ طبقے کے لوگ، جن کی تعداد کل آبادی میں ستر اسّی فی صدی ہوتی ہے، آج کل کی نسبت زیادہ آسودہ اور خوش حال تھے۔

تیسری فصل۔ بلبن کے جانشین

سلطنت دہلی کی جنگی قوت اب اس قدر زیادہ ہو گئی تھی کہ اگر مغلوں کے حملے کا اندیشہ نہ رہتا، تو بلبن ہی کے زمانے میں اس کی حدود نربدا سے آگے بڑھ جاتیں۔ چنانچہ آخر کار جب سلطان علاء الدین کے عہد میں شاہی افواج نے دکن پر پیش قدمی کی تو اس وقت انھیں یہاں کی کوئی ریاست نہ روک سکی، مگر ان فتوحات کا ذکر کرنے سے پہلے مناسب ہو گا کہ ہم واقعاتِ تاریخی کا سلسلہ درست رکھنے کے لیے مختصر طور پر بلبن کے جانشینوں کا حال بیان کر دیں۔

بلبن اگرچہ اپنے چھوٹے بیٹے بغرا خاں سے زیادہ خوش نہ تھا، مگر آخری بیماری میں اسی کو لکھنوتی سے بلا کر آیندہ جانشین سلطنت بنانے پر آمادہ ہو گیا۔ لیکن بغرا خاں کو بادشاہی کی ہوس نہ تھی اور باپ کا مرض ٹھیرا ہوا دیکھ کر وہ شکار کے بہانے سے خود ہی لکھنوتی چلا آیا۔ بلبن کو بہت رنج ہوا اور جب مرض میں دوبارہ شدت ہوئی تو اس نے وصیت کی کہ آیندہ بادشاہی کے لیے شہزادہ محمد (یا خان شہید) کے فرزند کیخسرو کو منتخب کیا جائے۔ مگر اس شہزادے سے محل کے ملازمین خوش نہ تھے۔ بظاہر انھی کی مخالفت سے اراکین سلطنت نے اسے اپنے باپ کی جگہ ملتان روانہ کر دیا اور شہر میں کیقباد کی بادشاہی کا اعلان ہو گیا جو بغرا خاں کا بیٹا اور صرف سترہ اٹھارہ برس کا نوجوان شہزادہ تھا (۶۸۶ھ / ۱۲۸۶ء)۔

معزالدین کیقباد

خود مختار بادشاہ ہوتے ہی کیقباد عیش و عشرت کا شکار ہو گیا، اور اس عیاشی نے نہ صرف خود اس کی صحت اور حکومت برباد کی، بلکہ پائے تخت دہلی

باب ۲

میں عام بداخلاقی پھیلادی۔ کیونکہ بادشاہ کا یہ میلان پاتے ہی دور دور سے ڈوم ڈھاڑی اور آبرو باختہ طوائف ہزاروں کی تعداد میں دہلی پہنچ گئیں۔ الناس علیٰ دین ملوکھم، خواص و عوام سب اسی رنگ میں رنگ گئے اور شاہد و شراب کی کثرت نے سارے شہر کو خرابات بنادیا۔ ان رنگ رلیوں میں، جن کی ہمعصر مورخ نے نہایت واضح تصویر کھینچی ہے، کام کا ہوش نہ بادشاہ کو تھا نہ اور درباریوں کو۔ سلطنت کی باگ ملک نظام الدین کے ہاتھ میں آگئی تھی جو ظاہرا "دادبک"[1] ورنہ درحقیقت "نائب ملک" یعنی مختار کار بن گیا تھا اور بادشاہ کی یہ غفلت و مدہوشی دیکھ کر اب خود تخت بادشاہی حاصل کرنے کی فکر میں تھا۔

بغراخاں کو یہ خبریں لکھنوتی میں پہنچیں اور تحریری نصیحت و پند کا کچھ اثر نہ ہوا تو اس نے اشتیاق آمیز خط لکھ کر بیٹے کو ملنے کے واسطے بلایا۔ ملاقات اودھ میں ہوئی اور جب نالائق مصاحبوں کے اغوا سے کیقباد نے اصرار کیا کہ بغراخاں دربار میں سلطنت دہلی کے خراج گزار کی حیثیت سے حاضر ہو تو دوراندیش باپ نے یہ شرط بھی منظور کرلی اور حسب دستور کورنش کرتا ہوا خاص تخت کے سامنے پہنچکر "خاک بوسی" کے لیے جھکنا چاہتا تھا کہ کیقباد ضبط نہ کرسکا اور تخت سے اتر کر خود اس کے قدموں میں گر پڑا! مثنوی "قران السعدین" اسی تاریخی واقعے کی یادگار ہے۔

اس ملاقات کا اتنا فائدہ تو ہوا کہ نوجوان بادشاہ نظام الدین سے بدگمان ہوگیا ورنہ باپ کے بہت کچھ سمجھانے بجھانے سے، پرہیز و پارسائی اختیار کرنے کی جو قسمیں اس نے کھائی تھیں، وہ چند ہی روز بعد توڑ دیں اور پھر اسی خرافات میں مبتلا ہوگیا جس نے دو ڈھائی برس میں اسے "ضعیف و زرد" کردیا تھا۔ ادھر نظام الدین کے ہاتھ سے اختیارات نکلتے ہی معاملات میں مزید ابتری پیدا ہوگئی اور جب انھی دنوں بادشاہ پر نشہ بازی کی بدولت فالج گرا تو ترک امرانے مشورہ

---

[1] امیرداد "خود مقدمات و مرافعات کی سماعت کرتا تھا لیکن دادبک کی حیثیت اس زمانے کی زبان میں، بادشاہ کے "معتمد عدالت" کی سمجھی جاتی تھی۔

باب

کر کے اسے معزول اور اس کے شیر خوار بچے شمس الدین کی بادشاہی کا اعلان کر دیا (۶۸۹ھ/۱۲۹۰ء) اسی ضمن میں انھوں نے چاہا کہ ان عہدہ داروں کو بھی جو خالص ترک نہ تھے مناصب جلیلہ سے الگ کر دیا جائے اور اس فہرست میں سب سے اوپر "عرض ممالک" ملک جلال الدین خلجی کا نام تھا۔ عارض یا عرض ممالک "فوج کے مہیا اور مرتب کرنے والے عہدہ دار کو کہتے تھے جسے راورٹی نے انگریزی میں "مسٹر ماسٹر" کے لفظ سے ترجمہ کیا ہے۔ یہاں یہ وضاحت اور کر دینی چاہیے کہ خلج یا خلجی لوگ بھی اگرچہ خالص ترکی نسل سے تھے لیکن ان کا قبیلہ صدیوں سے الگ ہو کر ہرات و کابل کے اقطاع میں آبسا تھا اور اس لیے اب وہ ایک جداگانہ قوم سمجھے جاتے تھے۔

سلطان جلال الدین خلجی۔

مذکورہ بالا سازش کی جلال الدین کو بروقت اطلاع پہنچ گئی۔ وہ نہایت آزمودہ کار سپہ سالار تھا اور اس کے بیٹوں کی شجاعت و قوت بھی مشہور تھی۔ شہر کے باہر اس کے ماتحت پچاس ہزار سے زیادہ جنگجو سوار فروکش تھے۔ ان کا ایک دستہ لے کر جلال الدین کے بیٹے ایک دن اچانک شہر میں گھس آئے اور نئے بادشاہ یعنی شیر خوار شمس الدین کو پکڑ کر لے گئے۔ اسی ہنگامے میں وہ ترک سردار بھی جو خلجیوں کی مخالفت میں پیش پیش تھا، مارا گیا۔ شہر کے لوگوں کو خلجیوں کی یہ زبردستی نہایت ناگوار گزری اور ان کا بہت بڑا گروہ لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ لیکن کوتوال نے بہ مشکل سمجھا کر بلوائیوں کو منتشر کر دیا ادھر بہت سے عہدہ داروں نے بہارپور کے پڑاؤ پر جا کر جلال الدین کی اطاعت قبول کر لی۔ ایک شخص جس کے باپ کو سلطان کیقباد نے مروا دیا تھا، خلجیوں کے اشارے سے محل میں آیا اور اس مفلوج و معزول بادشاہ سے جو پہلے ہی بستر پر پڑا دم توڑ رہا تھا، اپنے باپ کا انتقام لیا۔ یعنی بچھونے میں مار کر اس کی لاش جمنا میں پھینک دی۔

ایک اہم انقلاب

ماہ محرم ۶۸۹ھ/۱۲۹۰ء[1] میں سلطان جلال الدین خلجی نے تخت دہلی پر جلوس کیا،

---

[1] برنی (صفحہ ۱۷۵) اور غالباً اسی کی تقلید میں صاحب طبقات اکبری نے (۷۰) جلال الدین کی تاریخ تخت نشینی ۶۸۸ھ لکھی ہے۔ فرشتہ (صفحہ ۸۸) نے ایک سال اور بھی کم کر دیا جو سراسر غلط ہے! برنی کی غلطی کا سبب

باب ۲

خلجیوں کی شجاعت و سپہ گری پہلے سے مسلّم تھی لیکن ہندوستان کے باشندے جواب تک خالص ترک سلاطین کی رعایا رہے تھے، ان سپاہی پیشہ لوگوں کے بادشاہ بن جانے سے بہت ناراض ہوئے اور گو جلال الدین کی انتظامی قابلیت اور ذاتی صفات نے چندہی روز کے اندر ملک میں امن و انتظام قائم کردیا، نیز خود ترک امرا نے اس کی اطاعت قبول کرلی۔ بایں ہمہ یہ انقلاب، ہندوستان کی طرز حکومت کے حق میں نیک فال نہ تھا، اور اس نے امرا کی قوت توڑ کر یقیناً بادشاہ کی مطلق العنانی کو مزید تقویت پہنچائی اور گویا امکان پیدا کردیا کہ آیندہ محمد تغلق جیسے خود رائے اور ایذا رساں بادشاہ مدت دراز تک فرماں روائی کرتے اور لوگوں کو ستاتے رہیں۔ البتہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس اخلاقی اور اصولی نقصان کے مقابلے میں خلجی خاندان کے بادشاہوں سے ایک بہت بڑا فائدہ ہندوستان کو یہ پہنچا کہ انھوں نے شمالی ہند کو جنوبی ہند سے متصل کیا اور انھی کی حیرت انگیز اولوالعزمی اور فتوحات نے "برّاعظم ہندوستان" کو سیاسی طور پر پہلی مرتبہ "ایک ملک" یا "ایک سلطنت" بنایا اور کیساہی دھندلا اور سطحی سہی، درحقیقت یہی واقعہ یک خمس نوع بشر کے اس اتحاد کا پہلا نقش تھا جس کا محض خفیف و بعید امکان آج دنیا کے دوراندیش ارباب فکر کی نظر میں محکوم و شکستہ حال اہلِ ہند کے احترام کا سبب ہوسکتا ہے!

راجپوتانے اور مالوے کی شورش

لیکن دکن کی فتح کچھ عرصے بعد کی بات ہے۔ دہلی کی نئی حکومت کو مسلمان امرا کی مخالفت[۱] دفع کرنے کے بعد راجپوتوں اور مغلوں سے اپنے دیرینہ مقبوضات بچانے ہی

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کیقباد کے بچے کا "زمانۂ بادشاہی" شمار نہیں کیا اور کیقباد کی معزولی کی تاریخ ہی کو جلال الدین کی تخت نشینی کا سال قرار دے دیا یہ (غالباً کئی ہفتے بعد) دوسرے سال کے شروع کا واقعہ ہے جیسا کہ امیر خسرو نے مفتاح الفتوح میں صاف صاف تحریر کیا ہے اور اس کی تصدیق و توضیح میں سب سے اچھی شہادت مُلّا عبدالقادر نے فراہم کی ہے (دیکھو منتخب التواریخ صفحہ ۱۶۴)

[۱] ان میں سب سے سنگین مخالفت بلبن کے بھتیجے ملک اختیار الدین (عرف ملک چھجو) نے کی جو عام وراثت کے قاعدہ سے وارثِ سلطنت تھا۔ معلوم ہوتا ہے دہلی میں اس نے دب کر خلجیوں سے مصالحت اور کڑے کی اقطاع داری پر قناعت کرلی تھی لیکن یہاں پہنچ کر مصاحبوں کی شہ سے وہ دوبارہ اپنے "حق شرعی" کا دعویدار ہوا

باب ۲

دشوار ہوگئے تھے، راجپوتانے میں مسلمانوں کی مغربی سرحد کی جنگی چوکی منڈور تھی اور غالباً کیقباد کے عہد غفلت وعیش میں، آزاد قبائل راجپوت کو اس کے چھین لینے کا موقع مل گیا تھا۔ جلال الدین خلجی کے وقت میں راجپوتوں سے پہلی لڑائی یہیں ہوئی جس میں انھوں نے شکست کھائی قلعے پر دوبارہ حکومت دہلی کا قبضہ ہوگیا۔ لیکن رنتھنبور کا معاملہ دوسرا تھا۔ اس قلعے کے استحکام اور عمدہ جائے وقوع کا ذکر ہم پہلے پڑھ چکے ہیں۔ اسی ضمن میں یہ بھی ہم نے بتایا تھا کہ اجمیر پر مسلمانوں کا مستقل قبضہ ہونے کے بعد، راجپوتوں کی نظر میں رنتھنبور کی وقعت بڑھ گئی تھی اور ادھر حکومت دہلی کو رنتھنبور، نیز راجپوتانے کے دوسرے قلعوں کی چنداں پروا نہیں رہی تھی (صفحہ ۱۸۹) فریقین کے ان متضاد خیالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرکزی حکومت میں انتشار و سستی آتے ہی راجپوتوں کے ایک طاقتور جتھے نے اس قلعے پر بھی قبضہ کرلیا اور ساتھ ہی تمام مشرقی راجپوتانے اور شمالی مالوے میں شورش وبغاوت کی آگ بھڑک اٹھی؛ نئے بادشاہ نے مالوے کا دورہ خود کیا اور بڑے بڑے سرکشوں کو سزا دیتا ہوا رنتھنبور پہنچ گیا جہاں افواج شاہی نے باغیوں کو گھیر کر پہلے ہی قلعے کا محاصرہ کرلیا تھا۔ ساباط اور گرگچ بن چکے تھے۔ منجنیقیں نصب ہوچکی تھیں حملے کی تیاری میں کوئی کسر باقی نہ تھی لیکن جلال الدین کو اس وسیع و مستحکم قلعے کا بغور معائنہ کرنے کے بعد یہ تردد پیدا ہوگیا تھا کہ ایسے قلعے کی تسخیر میں کتنے مسلمانوں کی جان جائے گی، کتنی عورتیں بیوہ اور ان کے بچے یتیم ہوجائیں گے؟ وہ بالطبع نہایت حلیم و نیکدل تھا اور بادشاہ ہونے کے بعد باغیوں اور خونیوں تک کے قتل سے احتراز کرنے لگا تھا۔ اس موقع پر بھی جذبۂ خدا ترسی غالب آگیا اور اس نے حکم دیا کہ محاصرہ اٹھا لیا جائے! بعض امرا نے اس فیصلے کی مخالفت کی اور ہرچند عرض کیا کہ باغیوں کے ساتھ ایسی رعایت کرنے کا نتیجہ خراب ہوگا اور آیندہ سرکشوں کی جرأت اور بڑھ جائے گی لیکن

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ اور جلال الدین کو خاص اہتمام سے اس کا مقابلہ کرنا پڑا۔ لڑائی میں ملک اختیار الدین کو شکست ہوئی اور وہ گرفتار ہوگیا تھا لیکن جلال الدین نے اپنے قدیم آقا بلبن کے نمک کا پاس کیا اور اسے ملتان بھیج کر صرف نظربند رکھنے پر اکتفا کی۔

باب ۲

بادشاہ نے اسلام کی تعلیم اور کشت و خون سے تا امکان بچنے کی تعریف میں ایک لمبی تقریر کی اور فوج کو لے کر واپس دہلی چلا آیا۔[۱]

مغلوں کا حملہ

باایں ہمہ اگر سلطان اسلامی جہاد کو محض دفاعی جنگ سمجھتا تھا، تو اس کا بھی بہت جلد موقع پیش آگیا یعنی مغلوں کے ایک بڑے لشکر نے ہندوستان پر فوج کشی کی اور اگر ملا عبدالقادر کی روایت صحیح ہے[۲]، تو ستلج کو عبور کرکے سنام کے قریب تک پہنچ گئے جہاں افواج دہلی نے ان کا مقابلہ کیا اور کئی دن کی لڑائیوں میں اپنی جنگی برتری ثابت کردی: واضح رہے کہ اب مغل حملہ آور پہلے کی طرح بت پرست و کافر نہ تھے بلکہ ممالک اسلامی کی حکومت نے انھیں دین اسلام سے آشنا کردیا تھا اور ان میں سے بہت لوگ مسلمان ہو گئے تھے۔ اس فوج کا سردار عبداللہ بھی ہلاکو خاں کا نواسہ مگر ایک نومسلم مغل بادشاہ کا مسلمان بیٹا تھا۔ لہذا جلال الدین خلجی یقین کامیابی کے باوجود، مصالحت پر آمادہ ہوگیا اور ایک مغل سردار الغو خاں کو مسلمان کرکے اس کے ساتھ بخوشی اپنی بیٹی بیاہ دی۔ اسی کی تقلید میں اور بہت سے مغلوں نے اسلام قبول کیا اور دہلی میں آکر بس گئے[۳] (۶۹۱ھ / ۱۲۹۱ء)۔

علاء الدین کی یورش دکن پر

اس عرصے میں جنوبی مالوے کی شورش سلطان کے بھتیجے اور داماد ملک علاء الدین خلجی (حاکم کڑہ) نے فرو کی اور بہت سا مال غنیمت لے کر دربار میں حاضر ہوا اسی مہم کے دوران میں اس نے قلعۂ دیوگیر (یا دیوگیری موجودہ دولت آباد) کی دولت کے قصے سنے اور دل ہی دل میں اس پر حملہ کرنے کے منصوبے سوچنے لگا۔ ادھر سلطان کی بیوی (یعنی اپنی ساس) کی بدسلوکی نے اسے ہندوستان میں رہنے سے دل برداشتہ کردیا تھا غرض مختلف اسباب ایسے جمع ہوئے کہ آخر کار اس نے ۸ ہزار پایک اور تین چار ہزار[۴] چیدہ

---

[۱] ضیاء الدین برنی نے اس بحث کو تفصیل سے لکھا ہے (صفحات ۲۱۳ تا ۲۱۶)

[۲] منتخب التواریخ صفحہ ۱۷۰۔ برنی کی تاریخ میں سنام کی بجائے "ہرام" لکھا ہے (۲۱۸) جس کا ٹھیک پتا نہیں چلتا کہ یہ مقام کہاں تھا؟ اور اس لیے غالباً یہ کتابت کی غلطی ہے۔ (نیز ملاحظہ ہو، ایلیٹ جلد سوم صفحہ ۱۴۷)

[۳] فرشتہ نے اس فوج کی تعداد سات آٹھ ہزار سوار بتائی ہے (صفحہ ۹۵) اور ایک ہمعصر مورخ صاحب "طبقات ناصری" کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن مندرجۂ بالا قول برنی کا ہے (صفحہ ۲۲۲) جس کا چچا علاء الملک

باب ۴

سواروں کا ایک مختصر لشکر فراہم کیا اور چندیری کی تسخیر کے بہانے، جس کی سلطان سے اجازت مل گئی تھی، وسط ہند کے جنگلوں میں گھس گیا۔ راستے میں جو ریاستیں ملیں کسی کے راجہ نے اس کی مزاحمت نہ کی نہ وہ کسی سے اُلجھا اور ایلچپور ہو کر یکایک دیوگیر پہنچ گیا۔ فرشتہ کی روایت کے بموجب، دیوگیر کے چھوٹے سے پہاڑی قلعے کے گرد اس وقت کوئی فصیل یا خندق بنی ہوئی نہیں تھی[۱]۔ میدان کی دونوں لڑائیوں میں کثرت تعداد کے باوجود اہل دکن کو شکست ہوئی۔ راجہ کو اضلاع ایلچپور کے علاوہ بے شمار مال فتحمندوں کی نذر کرنا پڑا جس میں ایک ہزار من چاندی[۲]، سو من سونا، سات من موتی اور دو من جواہرات شامل تھے۔ قیمتی لباس اور دیگر اجناس اتنی ملی تھیں کہ ان کی تفصیل دشوار ہے" وعقل نیز از تصدیق آں ابا دارد[۳]"

جلال الدین کا قتل۔

مسلمانوں کا دکن پر یہ پہلا حملہ تھا، لیکن ان کی مرکزی حکومت کو دخل ایک طرف اس حملے کی اطلاع تک نہ تھی۔ البتہ جب علاءالدین واپس روانہ ہوا تو فتح سے بڑھ کر اس کے بے حساب مال غنیمت کی سارے ملک میں شہرت ہوگئی۔ دربار دہلی کے ہوشمند امرا نے تو یہ خبر سنتے ہی پیشین گوئی کر دی تھی کہ علاءالدین کے پاس اس قدر زر و جواہر کا جمع ہو جانا آیندہ فساد و بغاوت کی تمہید ہے۔ لیکن بوڑھے سلطان کو اس قسم کا کوئی فکر نہ تھا اور وہ یقین رکھتا تھا کہ بہت جلد اس کا بھتیجا تمام غنائم کو اس کے سامنے لا کر پیش کر دے گا جیسا کہ مالوے کی مہم کے بعد اس نے کیا تھا؛ علاءالدین کے خطوط سے بھی اس یقین کو تقویت ہوئی۔ لیکن کڑے پہنچ کر جب اس نے کبھی درا ندازوں کی مخالفت کبھی عتاب شاہی کا خوف

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:۔ اس وقت کڑے میں موجود اور علاءالدین کا محرم راز تھا۔ اور چلتے وقت اسی کو علاءالدین نے اپنے صوبے کا نائب بنایا تھا۔

[۱]۔ فرشتہ، صفحہ ۹۵۔

[۲]۔ اس من سے غالباً وہ من مراد ہے جس میں جواہرات تلتے تھے اور جو وزن میں دو رطل یعنی موجودہ ایک سیر کے قریب ہوتا تھا۔

[۳]۔ فرشتہ صفحہ ۹۵۔

باب ۲

کبھی کثرت باراں کا عذر کیا، نیز اس کے تازہ لشکر فراہم کرنے اور لکھنوتی پر فوج کشی کے ارادے کی افواہیں پایۂ تخت میں پہنچیں تو اس وقت تمام اہل الرائے پر اس کی نیت کا فساد ظاہر ہو گیا۔ بایں ہمہ جلال الدین کو زعم تھا کہ وہ بھتیجا جسے خود میں نے پالا اور بیٹوں سے زیادہ عزیز رکھا ہے، کبھی میرے ساتھ برائی نہ کرے گا۔ البتہ دیوگیر کے جواہرات کی اُسے لو لگی ہوئی تھی اور اسی لیے بار بار بھتیجے کو اشتیاق آمیز خط لکھ کر دہلی بلاتا تھا۔ عجب نہیں کہ علاء الدین بھی اس شوق ملاقات کی اصلی وجہ کو سمجھ گیا ہو۔ شاید اسی بنا پر اس نے اپنے بھائی الماس بیگ کو دہلی خط لکھا اور پایۂ تخت آنے میں اندیشۂ جان اور بہت سی مجبوریاں ظاہر کرنے کے ساتھ یہ بات بھی جتا دی کہ اس موقع پر اگر خود سلطان معمولی جمعیت ہمراہ لے کر کڑے آنے کی زحمت گوارا کریں تو دیوگیر کے تمام غنائم بے تامل ان کی خدمت میں پیش کر دئے جائیں گے! جلال الدین دھوکے میں آگیا اور کثرت بارش کے باوجود گنگا کے کنارے "مقام ڈھائی" (موجودہ ڈہائیں ؟) سے کشتی میں سوار ہو کر چند روز میں کڑے آپہنچا۔ سامنے کے کنارے پر علاء الدین اپنی تمام فوجی جمعیت کے ساتھ استقبال کو آیا تھا۔ عصر کے بعد روزہ دار سلطان کا بجرا کنارے پر لگا، بھتیجے نے اُترتے ہی جھک کر قدم لیے مگر عین اس وقت کہ بوڑھا چچا ہاتھ میں ہاتھ لیے محبت و اخلاص کی باتیں کر رہا تھا، خونیوں نے گھات سے نکل کر حملہ کیا۔ جلال الدین ہاتھ چھوڑ کر یہ کہتا ہوا اپنے بجرے کی طرف دوڑا کہ "اے علاء بدبخت چہ کردی" لیکن حملہ آوروں نے دریا تک پہنچنے کی مہلت نہ دی اور گرا کر اس کا سر کاٹ لیا[1]۔ ماہ رمضان ۶۹۵ھ / ۱۲۹۵ء۔

لہ۔ اس عبرتناک واقعے کو تمام فارسی مورخوں نے قریب قریب اسی طرح لکھا ہے اور علاء الدین اور اس کے ساتھیوں پر سخت لعنت و نفرین کی ہے۔ خاص کر برنی نے کئی صفحے اظہار رنج و غضب میں بھر دئے ہیں (۲۳۵ وغیرہ) لیکن خاص کڑے کے لوگوں میں اس سے مختلف روایت مشہور ہے جس میں جلال الدین پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ خود وہ بھتیجے کو مارنے یا قید کرنے کی نیت رکھتا تھا۔ مگر یہ روایت کچھ قابل اعتبار نہیں معلوم ہوتی۔

ضمیمۂ باب ۲

طوطیِ ہند امیر خسروؒ

سلطان شمس الدین ہی کے عہد میں فارسی کے بہت سے قادرالکلام شعرا دربارِ دہلی میں جمع ہو گئے تھے جن میں امیر روحانی اور ناصری زیادہ مشہور رہیں، پھر شہاب مہمرہ بدائونی عمید تولکی اور شمس الدین دبیر کا دور آیا جن کے جستہ جستہ حالات اور اشعار اس عہد (ساتویں صدی ہجری) کی تصانیف اور نیز بعد کی تاریخوں میں محفوظ ہیں۔ امیر خسروؒ نے بھی اپنی تصانیف میں ان کی مدح وثنا کی ہے اور حق یہ ہے کہ ان کا عمدہ کلام، چند خاص اساتذہ کے سوا دیگر شعرائے ایران کے کلام سے کسی طرح کم رتبہ نہ تھا لیکن ملا عبدالقادر کے بقول[۱] "سورج کے بلند ہوتے ہی جو حال ستاروں کا ہو جاتا ہے...... وہی کلام خسروؒ کے سامنے ان کا ہوا یعنی سب ماند پڑ کر رفتہ رفتہ غائب ہونے لگے اور ان کے کلام کا بہت ہی تھوڑا حصہ ہے جو اس زمانے تک بہ مشکل باقی رہ گیا۔"

*

[۱] منتخب التواریخ صفحہ ۱۷۔ ان سب شعرا کا منتخب کلام بھی ملا صاحب نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے اور غالباً ان کمیاب اشعار کے ایسے اچھے نمونے اور کسی کتاب میں مشکل سے ملیں گے۔ (دیکھو منتخب التواریخ جلد اول صفحات ۶۵، ۷۱ تا ۷۰، ۹۴ و ۹۹ تا ۱۲۷)۔

باب ۲

امیر خسروؒ کے والد امیر سیف الدین مضافات بلخ سے ترک وطن کر کے ہندوستان کے ایک گاؤں پٹیالی (یا مومن آباد) میں آبسے تھے، جو ان دنوں صوبہ بداؤں میں داخل تھا۔ یہیں غالباً ۶۵۱ھ کے اخیر میں یہ جامع کمالات بزرگ پیدا ہوئے جن کے مولد ہونے پر ملک ہند جتنا فخر کرے بجا ہے[۱]۔ مگر لڑکپن میں آپ کے والد کا انتقال ہو گیا اس لیے آیندہ تعلیم و تربیت دہلی ہی میں ہوئی جہاں آپ کے نانا عماد الملک پائے تخت کے عالی رتبہ امرا میں شمار ہوتے تھے۔ اسی شہر میں حضرت امیرؒ کو سلطان نظام الدین اولیاؒ کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوا اور حضرت موصوف کے ساتھ اس ارادت و شیفتگی کی ابتدا ہوئی جو آج تک ضرب المثل ہے۔ امیر خسروؒ نے بہت کم عمری سے شعر کہنا شروع کیا تھا اور جوانی ہی میں ان کے کلام کی شہرت ہو گئی تھی[۲]۔ شاید یہی سبب ہے کہ ابتدا سے لوگوں میں وہ اپنے تخلص "خسرو" سے مشہور ہو گئے ورنہ اصلی نام "ابو الحسن" تھا۔ باقی "امیر" اعزازی لقب ہے اور وہ نسلاً خالص ترک ہیں۔ اپنی شعر گوئی اور خاندانی وجاہت کی بدولت

---

[۱] انگریزی زبان کی سب سے تازہ اور مستند تاریخ "اوکسفورڈ ہسٹری اوف انڈیا" (مطبوعہ ۱۹۱۹ء) کے فاضل مولف ونسنٹ اسمتھ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ عہد بلبن میں فتنۂ مغول کے خوف سے جو بادشاہ اور شہزادے اپنا وطن چھوڑ کر دہلی میں پناہ گزیں ہوئے۔ ان کی "ملازمت یا مصاحبت میں بہت سے ادیب بھی تھے جن میں امیر خسروؒ شاعر سب سے زیادہ مشہور رہیں" (صفحہ ۲۲۹) سمجھ میں نہیں آتا کہ فاضل مولف نے جبکہ امیر صاحبؒ کی ولادت اور حالات زندگی سے واقفیت بہم پہنچانے کی تکلیف گوارا نہیں کی، تو ان کی نسبت یہ آدھی سطر لکھنی بھی کیا ضرور تھی؟ یہاں اتنی صراحت اور کر دینی چاہیے کہ امیر صاحبؒ کے والد سلطان شمس الدین کے زمانے میں ہندوستان آئے تھے اور ان کا ان "پناہ گزین شہزادوں" سے کوئی خاص تعلق نہ تھا جو دربار بلبن کی زینت بڑھاتے تھے۔ امیر صاحب کے سنہ ولادت میں اختلاف ہے۔ قران السعدین کے ایک شعر سے خیال ہوتا ہے کہ وہ ۶۵۲ھ میں پیدا ہوئے۔ لیکن یہ صحیح نہیں اور تاریخ فرشتہ میں آپ کی عمر کے متعلق جو "شصت و چہار" لکھا ہے (جلد دوم۔ ۲۰۴) وہ بھی کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ مدنا آپ نے چوہتر سال کی عمر میں وفات پائی جس کے ۷۲۵ھ میں کوئی اختلاف اور شبہ نہیں اور آپ کی لوح تربت پر جو قطعۂ وفات کندہ ہے اس سے بھی یہی سال برآمد ہوتا ہے۔

[۲] چنانچہ آپ کے پہلے دیوان "تحفۃ الصغر" میں ۱۶ سے ۱۹ برس کی عمر تک کا کلام جمع کیا گیا تھا۔

امیر صاحبؒ جوانی سے امرائے دہلی کے طبقے میں روشناس ہو گئے تھے اور شہزادۂ محمد کے وقت سے محمد تغلق کے ابتدائی عہد تک شاہان دہلی کے محبوب و ممتاز مصاحب رہے۔ اس تعلق سے انھیں دربار کے اندرونی حالات اور تاریخی واقعات معلوم کرنے کا نہایت عمدہ موقع مل گیا اور ان کے کلام کا معتد بہ حصہ تاریخی منزلت رکھتا ہے۔ چنانچہ سر ہنری الیٹ نے اپنی تاریخ ہند مرتب کرتے وقت امیر صاحبؒ کی "تاریخ علائی" (یا خزائن الفتوح) کے ساتھ بڑی محنت سے ان کی تاریخی مثنویوں کے بعض حصوں کا بھی انگریزی میں ترجمہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ تاریخی حیثیت سے امیر خسروؒ کے بیان کی صحت میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا کیونکہ جن واقعات کا وہ ذکر کرتے ہیں، ان میں نہ صرف خود موجود تھے بلکہ اکثر معاملات میں ان کی شرکت بھی تھی یہی وجہ ہے کہ ان کا دوست مورخ ضیاء الدین برنی اپنے قول کی تصدیق کے لیے جا بجا امیر صاحبؒ کو گواہ بناتا ہے۔[1]

امیر صاحبؒ کے مجموعۂ کلام کے متعلق عام طور پر مشہور ہے کہ آپ کے کل اشعار کی تعداد چار لاکھ سے زیادہ ہے۔[2]

نثر میں جو کتابیں لکھیں وہ اس کے علاوہ ہیں اور ان میں خزائن الفتوح، انشائے خسروی اور چہار درویش فارسی، بہت مشہور ہوئیں لیکن امیر صاحبؒ کی اصلی ناموری ان کی شاعری پر مبنی ہے اور غزل گوئی میں وہ اور ان کے محبوب دوست میر حسن دہلوی سعدی شیرازیؒ کے سب سے اچھے جانشین مانے گئے ہیں۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ ان صاحبوں کے تھوڑے عرصے بعد ہی خاک شیراز نے ایسا شخص پیدا کیا کہ دنیا کا کوئی شاعر آج تک غزل گوئی میں اس کا مد مقابل نہ ہوا اور اس کے سامنے سب قدما کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ بایں ہمہ ہندوستان کے یہ دونوں شاعر فارسی اساتذہ کی صف اول میں شمار ہوتے ہیں۔

---

[1] الیٹ جلد سوم، صفحہ ۶۷، نیز ملاحظہ ہو ضمیمۂ جلد مذکور

[2] تاریخ فرشتہ، صفحہ ۴۰۲۔ الیٹ جلد سوم صفحہ ۵۲۳ بحوالہ کودل۔ وغیرہ۔ صاحب تذکرہ آتشکدہ اسی روایت کو نقل کر کے لکھتے ہیں کہ ان میں سے ایک لاکھ شعر خود میری نظر سے گزرے ہیں۔ (حیات خسرو، صفحہ ۸۷)۔

باب ۲

پنج گنج خسرو۔ (یعنی وہ پانچ مثنویاں جو خمسۂ نظامیؒ کے جواب میں لکھی گئی تھیں)
اور تین تاریخی مثنویاں، یعنی قران السعدین، خضر خاں، دول رانی اور نہ سپہر
نیز مطلع الانوار فارسی نظم کی نہایت بلند رتبہ تصانیف ہیں اور حال میں انھیں
مدرسۃ العلوم علی گڈھ کی طرف سے خاص اہتمام کے ساتھ چھاپ کر شائع کیا گیا
ہے۔ دیگر فارسی اساتذہ کے مقابلے میں امیر خسروؒ کی مثنوی کے حسن و خوبی پر بحث کرنے کا
یہ محل نہیں ہے۔ مشرق اور حال میں مغرب کے نقاد اس مبحث پر بہت کچھ لکھ چکے ہیں
یہاں صرف اس قدر لکھنا کافی ہوگا کہ امیر صاحبؒ ایک طرز خاص کے مالک ہیں
اور ان کا نام نامی اس فہرست میں داخل ہے جس میں فردوسیؒ، نظامیؒ اور جامیؒ
جیسے سحر بیان شعرا کا نام آتا ہے۔ اب یہ انفرادی ذوق کی بات ہے کہ بعض نقاد
ان میں سے کسی ایک استاد کو باقی پر ترجیح دیں ورنہ ان میں سے ہر شخص اپنی اپنی جگہ
مسلم الثبوت شاعر اور اپنی طرز میں سب سے اچھا سخن طراز ہے۔

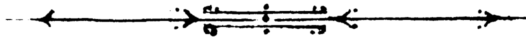
فارسی کی طرح امیر خسروؒ عربی، ترکی اور ہندی میں بھی عمدہ اور بے تکلف شعر
کہہ سکتے تھے اور اصناف شعر میں صاحب ایجاد ہونے کے علاوہ فن موسیقی میں بھی ان کو
ایک مجتہد کا مرتبہ حاصل ہے۔ تصوف کے اعتبار سے وہ خاندان چشتیہ کے محترم رکن
مانے جاتے ہیں اور ان کی دینداری اور تقوے کی بہت سی روایتیں کتابوں میں محفوظ
ہیں۔ مگر شاید ان کی سب سے زیادہ قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ ملک ہندوستان سے
دلی محبت رکھتے ہیں اور یہاں کی ہر چیز خاص کر ہندی زبان کی جا بجا انھوں نے
تعریف و حمایت کی ہے۔ بلکہ یہ کہنا کچھ غلط نہ ہوگا کہ نووارد مسلمانوں کے دل میں
سب سے پہلے جس ادیب نے ہندوستان کی وطنیت اور محبت کا جوش پیدا کرنے کی
کوشش کی وہ امیر خسروؒ ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ انھی کے فیض صحبت سے یہ جذبہ
ان کے ہمعصر مصنفوں میں بھی پیدا ہو گیا تھا۔ خود امیر صاحبؒ ہندی زبان کو مسلمانوں
میں پھیلانے کے جس قدر خواہاں تھے، اس کا سب سے اچھا ثبوت ان کی مشہور
کتاب "خالق باری" ہے۔ یوں بھی وہ اپنی تصنیفات میں کہیں کہیں ٹھیٹھ ہندی الفاظ
کا استعمال کرتے ہیں اور ان کے بعض اشعار میں آدھے آدھے مصرعے ہندی کے نظر
آتے ہیں۔ میر تقی میرؔ نے اپنے تذکرۂ شعرا میں نیز بعض دیگر مصنفوں نے زبان اردو (یا ریختہ

کا سب سے پہلا شاعر بلکہ موجد امیر خسروؒ کو تسلیم کیا ہے اور دو شعر بھی ان سے منسوب کئے ہیں جنھیں "اردو" کہنا غلط نہیں، لیکن یہ لکھنے کی شاید ضرورت نہیں کہ مستقل زبان کی حیثیت سے اس وقت تک "اردو" نے جنم نہیں لیا تھا اور اس لیے امیر خسروؒ کے ہندی آمیز اشعار کو ان کی شاعرانہ جدت یا محض تفنن سمجھنا چاہئے۔

امیر صاحبؒ کا انتقال ۷۲۵ھ میں ہوا اور اپنے محبوب مرشد سلطان نظام الدینؒ کے قریب ہی ان کا مدفن بھی آج تک زیارت گاہِ مشتاقان بنا ہوا ہے۔ ان کے دو سال بعد میر حسن دہلوی نے وفات پائی۔ ملا عبدالقادر کے بقول وہ اس وقت دولت آباد (دکن) میں تھے، وہیں دفن ہوئے*۔

"آں دو طوطی کہ بہ نوخیزی شاں　　بود در ہند شکر ریزئ شاں
آخرش سخرۂ افلاک شدند　　خامشاں قفس خاک شدند"

جامیؒ



* مخدومی مولوی غلام یزدانی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ خلد آباد کے جنوبی دروازے کے باہر جنوب مغرب میں کوئی چار سو قدم کے فاصلے پر میر حسنؒ کا مزار ہے۔

باب ۳

سلطنت دہلی کی انتہائی وسعت

پہلی فصل:- فتوحات گجرات و دکن

ممالک گجرات و دکن کا سلطنت دہلی سے الحاق، آیندہ نصف صدی کی سیاسی تاریخ کا سب سے اہم واقعہ ہے۔ ان دونوں ملکوں کی سرحد تک مسلمانوں کے قدم پہلے پہنچ چکے تھے، اور سلطان محمود کے حملۂ سومنات سے قطع نظر قطب الدین ایبک کے زمانے میں نہروالہ (انہلواڑہ) پائے تخت گجرات پر، حکومت دہلی کا مستقل قبضہ ہوگیا تھا۔ (صفحہ ۱۱۹) علاء الدین خلجی نے شمالی دکن پر جو یلغار کی اور دیوگیری کے راجہ سے اطاعت گزاری کا اقرار لیا، اس کا حال بھی اوپر ہماری نظر سے گزر چکا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ حملہ محض ایک ہنگامی تاخت تھی اور اگر تقدیر علاء الدین خلجی کو تخت دہلی کا مالک نہ بنادیتی تو شاید اس حملے کا ذکر بھی تاریخ سے محو ہوجاتا۔ اسی طرح نہروالہ کی تسخیر کے باوجود جزیرہ نمائے گجرات پر مسلمانوں کا تسلط نہیں ہوا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس اکیلے شہر پر بھی اسلامی حکومت غالباً زیادہ عرصے تک برقرار نہ رہ سکی، کیونکہ گجرات کے

باب

شاداب علاقے سے قطع تعلق ہوتے ہی اس کے ہر طرف راجپوتانے کا ویران ریگستانی علاقہ رہ گیا اور حکومت دہلی کے لیے یہ بات نہایت دشوار ہوگئی کہ وہاں کوئی بڑی چھاؤنی بنا کر اسے اپنے دوسرے مقبوضات سے کمک پہنچانے کا انتظام کردیتی، پس گو کہیں صراحت کے ساتھ تحریر نہیں ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ قطب الدین کے بعد ہی اسلامی فوجوں کو یہاں سے واپس بلانا پڑا اور اس شہر پر بھی گجرات کے راجاؤں کا دوبارہ قبضہ ہوگیا تھا۔

فتح گجرات ۶۹۷ھ ۱۲۹۷ء

انہلواڑے کی طرح، مالوے کے شہروں پر بھی اسلامی حکومت پوری طرح قائم نہ ہوئی تھی، اور جنوبی راجپوتانے پر تو کبھی سابق سلاطین دہلی نے فوج کشی ہی نہیں کی کیونکہ یہ صحرائی علاقے نہایت گرم و دشوار گزار تھے۔ لیکن سلطان علاء الدین خلجی گجرات اور مالوے کے شاداب اور زرخیز صوبوں کے مستقل الحاق کا تہیہ کرچکا تھا اور دہلی کے جنگجو مدبروں سے یہ بات مخفی نہ تھی کہ جب تک جنوبی راجپوتانے کے مستحکم پہاڑی قلعے فتح نہ ہوں گے یا وہاں کے دلیر و آزاد قبائل پر سلطنت دہلی کی سطوت کا نقش نہ بیٹھ جائے گا، اس وقت تک مذکورۂ بالا ممالک پر اطمینان و استقلال کے ساتھ حکومت کرنی دشوار ہوگی، پس اگرچہ گجرات کو مسلمانوں نے علاء الدین کی تخت نشینی کے دوسال بعد ہی فتح کرلیا اور وہاں کے راجہ کو نکال کر اپنا قبضہ جمالیا تھا۔ (۶۹۷ھ ۱۲۹۷ء)[1] لیکن اس کی تکمیل اور مضبوطی کے لیے وہ آیندہ چھ سات برس تک راجپوتانے میں شمشیر زنی کرتے رہے اور چتوڑ کی تسخیر (۷۰۳ھ ۱۳۰۳ء) سے پہلے انھوں نے مالوے کے الحاق کی کوشش نہیں کی۔

۱۔ گجرات کا راجہ رائے کرن دیوگیری چلا گیا تھا اور پھر غالباً وہیں کے راجہ کی اجازت سے بگلانہ میں حکومت کرنے لگا۔ بگلانہ دریائے تاپتی کے جنوب میں شمال مغربی دکن کے اس پہاڑی خطے کو کہتے تھے جو عرض میں ۶۰ اور طول میں ۲۰۰ میل کے قریب تھا اور یہاں کے نیم آزاد زمینداروں پر کبھی راجۂ گجرات اور کبھی راجۂ دیوگیری کی حکومت رہا کرتی تھی (دیکھو گزیٹیر، جلد ششم صفحہ ۱۹۱) رائے کرن کی اسی فراری میں اس کی رانی کنولا دیوی گرفتار ہو کر دلی آئی۔

باب ۳
سعی فتح
(۱) عالم ناراہی

دراصل جنگی دشواریوں کے علاوہ، ان فتوحات میں تاخیر کی ایک وجہ تو بادشاہ کی غیر ہردلعزیزی تھی کہ وہ نہایت سخت گیر اور جابر سپاہی تھا اور حصول مقصد کے لیے بالعموم تشدد سے کام لیتا تھا، مگر اس سے بھی بڑھ کر ایک سبب جو بیرونی فتوحات میں مانع آتا رہا بلکہ بعض اوقات اس نے بہت خطرناک صورت اختیار کرلی، مغلوں کے پیہم حملوں کو سمجھنا چاہیئے کہ انھی آٹھ دس برس میں انھوں نے کم سے کم چھ مرتبہ نہایت وسیع پیمانے پر فوج کشی کی اور کئی مرتبہ پائے تخت دہلی تک بڑھ آئے۔

علاء الدین خلجی نے جیسی سنگدلی کے ساتھ اپنے چچا اور ولی نعمت کو قتل کرایا اس نے لوگوں کو قدرتی طور پر اس سے متنفر کردیا تھا اور ہمعصر مورخ نے اس کے حال میں جو کچھ تحریر کیا ہے اس کے ہر ورق سے بیزاری ٹپکتی ہے؛ درحقیقت، اگر جلال الدین خلجی کی بیوہ، **ملکۂ جہاں** کی جلد بازی اور خود رائی سے دہلی میں اس کے چھوٹے بیٹے کی بادشاہی کا اعلان نہ ہوجاتا اور جلال الدین کا بڑا بیٹا **ارکلی خاں**، ملتان سے پائے تخت پہنچ جاتا تو علاء الدین کو کڑے سے دہلی کی طرف بڑھنے کی جرأت بھی نہ ہوتی۔ لیکن مذکورۂ بالا اعلان کی خبر سن کر ارکلی خاں جس کی شجاعت ولیاقت مسلمہ تھی، اپنی ماں سے ناراض ہوگیا۔ اور دلی کا سفر ملتوی کرکے ملتان ہی میں رک گیا اور ادھر یہ اطلاع ملتے ہی علاء الدین کو، جو لکھنوتی کی طرف چلے جانے کا ارادہ کررہا تھا تخت دہلی لینے کی امید ہوگئی اور وہ پائے تخت کی جانب اس شان سے چلا کہ:۔

"خزانہ ریز شد منزل بہ منزل
بہ زر کردہ کلید کار مشکل
بہر منزل زپیش تخت تا دور
فشاندے گنجہا بے منع گنجور
چو با دہلی فتاد از فتح کارش
گرفت از منجنیق زر حصارش"

اور یہ شاعری نہیں واقعہ ہے کہ اس کوچ میں ایک چھوٹی منجنیق سے کئی سیر سونے کے پھول ("اختر زر") روزانہ علاء الدین پر سے نچھاور کیے جاتے تھے اور جو لوگ اس کی فوج میں بھرتی ہوتے انھیں صدہا روپیہ بطریق انعام تقسیم ہوتا رہتا تھا۔[1]

---

[1] برنی، صفحہ ۲۴۳۔ نیز دیکھو فرشتہ صفحہ ۱۰۱، طبقات اکبری وغیرہ امیر خسروؒ کی نظم و نثر میں بھی کئی جگہ ان واقعات کا ذکر آیا ہے۔

باب ۲ جلال الدین کے اہل و عیال کا حشر

اس طرح دکن کا بے حساب خزانہ لٹاتا ہوا جب وہ بداؤں پہنچا تو ایک لشکر کثیر اس کے ساتھ ہوگیا تھا اور اس زرپاشی نے عوام الناس ہی کو نہیں بلکہ عمائدین دہلی کو بھی رام کرلیا۔ یہ لوگ علاء الدین کے جرم پر اسے نفرین کرتے تھے لیکن ملکۂ جہاں اور اس کے چھوٹے بیٹے ابراہیم کی بادشاہی سے بھی رضامند نہ تھے۔ لہذا پائے تخت سے جو فوج لڑنے کے لیے بھیجی گئی تھی اس کے بعض سردار بطور خود اور اکثر روپیہ لے کر علاء الدین کے ساتھ جا ملے اور پانی کا زور کم ہوتے ہی وہ جمنا اتر کر دہلی کے سامنے پہنچ گیا۔ ابراہیم پہلے دن لڑنے نکلا تھا، مگر بہت کم لوگوں نے اس کا ساتھ دیا اور وہ اپنی ماں اور بیوی بچوں کو لے کر اسی رات ملتان کی طرف فرار ہوگیا۔

علاء الدین کی تخت نشینی کی رسم ۶۹۵ھ/۱۲۹۵ء کے آخری مہینے میں بڑی دھوم دھام سے منائی گئی۔ عیش و طرب کے جس قدر سامان ممکن تھے، کمال دریا دلی سے مہیا کئے گئے۔ بادشاہ کی طرف سے وسیع پیمانے پر لوگوں کی مہمانی اور مدارات کا اہتمام ہوا۔ قدیم عماید و امرا کے مناصب و جاگیرات میں اضافے ہوئے مستحقین کو بہت سا روپیہ صدقہ و خیرات میں تقسیم ہوا اور ہر طبقے کے افراد کو حسب مراتب اتنا انعام ملا کہ محتاج فارغ البال اور فارغ البال مالا مال ہوگئے اور ان رنگ رلیوں میں انھیں یہ بات بھی یاد نہ رہی کہ جس شخص کی اطاعت گزاری کا آج حلف اٹھا رہے ہیں، اسی کو چند روز پہلے صلواتیں سنایا کرتے تھے[سلہ]۔ سلطان مقتول کے ورثا کی جانب سے جو خلش علاء الدین کے دل میں تھی، وہ بھی بہت جلد دفع ہوگئی اور دہلی سے جو سرداران کے تعاقب میں روانہ کئے گئے تھے وہ کامیاب واپس آئے۔ یعنی گو ملکۂ جہاں، اس کا چھوٹا بیٹا اور دوسرے عزیز و رفیق، ارکلی خاں والئ ملتان کے پاس پہنچ گئے تھے لیکن جب تعاقب کرنے والی فوجوں نے شہر کا محاصرہ کیا تو حکومت دہلی کی صدارت و مرکزیت

سلہ۔ "و خلق را اشتغال ہائے تازہ فرمود و خلق چناں فریفتۂ زر گشت کہ نام قبح فعل سلطان علاء الدین و کفران نعمت او بر زبان کسے نمی رفت و از ذوق گرفتن زر ہواہاں را پروائے ہیچ کارہ نماندہ بود" برنی صفحہ ۲۴۸۔

باب ۳

کا ملک میں اتنا اثر قایم ہوگیا تھا کہ 'خود اہل ملتان'' افواج سلطانی'' کے خلاف لڑنے سے انکار کرنے لگے اور آخر میں جاں بخشی کے وعدے پر ارکلی خاں کو اطاعت قبول کرنی پڑی۔ بادشاہ نے اس '' وعدے'' کی خلاف ورزی نہیں کی لیکن جلال الدین کے بیٹوں اور دامادوں کی آنکھوں میں نیل کی سلائیاں پھروا کر عمر بھر کے لیے ہانسی کے قلعے میں محبوس کر دیا!

(۲)؛- حملۂ مغول
ملتان کی یہ مہم سلطان کے بھائی الماس بیگ الملقب بہ الغ خاں اور ملک ہزبرالدین ظفر خاں نے سر کی تھی اور یہی علاء الدین خلجی کے سب سے بہادر و معتمد علیہ سپہ سالار تھے۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں (۶۹۶ھ / ۱۲۹۶ء) جب اطلاع ملی کہ مغلوں نے فتح پنجاب کے ارادے سے بڑے اہتمام کے ساتھ فوج کشی کی اور دریائے سندھ کو عبور کر لیا ہے تو یہی دونوں سردار مقابلے کے لیے بھیجے گئے اور انھوں نے حملہ آوروں کے ٹڈی دل کو جالندھر سے آگے بڑھ کر روکا۔ مغلوں کی تعداد ایک لاکھ کے قریب بیان کی گئی ہے اور غالباً ابھی تک ان کی اتنی بڑی فوج سے اہل دہلی کھلے میدان میں نہیں لڑے تھے۔ لیکن ان کی جو ہیبت چھائی ہوئی تھی، بلبن کے زمانے سے اس میں بہت فرق آگیا تھا۔ اسی بادشاہ کی کوشش اور فوجی تنظیم کی بدولت ہندوستان کی سپاہ فنون سپہ گری، جنگی مستعدی اور قواعد دانی میں شاید کسی معاصر قوم سے کمتر نہ رہی تھی اور جنگ کے نتیجے نے ثابت کر دیا کہ سرداروں کی قابلیت اور سپاہیوں کی جانبازی کے اعتبار سے بھی اہل ہند کو اپنے حریفوں پر برتری تھی:- فرشتہ کی روایت کے بموجب تقریباً بارہ ہزار مغل سپاہی مارے گئے اور انھیں سخت شکست ہوئی۔

اس کامیابی نے علاء الدین کے حق فرماں روائی کو نہایت قوی کر دیا اور اب اس کے نئے وزیر نصرت خاں جلیسری نے امرائے جلالی سے وہ روپیہ واپس

۱۔ برنی صفحہ ۲۴۹۔ فرشتہ صفحہ ۱۰۲ وغیرہ۔

۲۔ برنی صفحہ ۲۴۹۔ فرشتہ کی روایت کسی اور تاریخ سے ماخوذ معلوم ہوتی ہے اس نے لڑائی کا مقام ''حدود لاہور'' اور واقعات زیادہ تفصیل سے لکھے ہیں۔ (صفحہ ۱۰۲)۔

باب

وصول کرنا شروع کیا جو علاء الدین کی آمد کے وقت بطریق رشوت انھیں دیا تھا۔ اس میں قدیم امرا پر بڑی بڑی سختیاں ہوئیں طبقۂ اعلیٰ کے بہت کم خاندان ایسے تھے جو نصرت کے جبر و تشدد سے محفوظ رہے ورنہ اکثر قدیم امرا کا مال و اسباب اور جاگیریں چھین لی گئیں اور بعض کو نہایت سخت سزائیں دی گئیں جس کی وجہ سے نہ صرف نصرت خاں، بلکہ خود بادشاہ سے طبقۂ امرا میں دوبارہ بیزاری پیدا ہو گئی۔ مگر بادشاہ کو فوجی تیاریوں کے لیے روپے کی ضرورت تھی۔ بدنامیوں کی اس نے کچھ پروانہ کی اور بہت جلد ایک بڑی فوج مرتب کر کے گجرات روانہ کی جس کے الغ خاں اور نصرت خاں سپہ سالار تھے۔ گجرات (نیز کھنبایت) کی فتح کے علاوہ جس کا اجمالاً پہلے ذکر آ چکا ہے، اس حملے میں بہت سا مال غنیمت بھی ہاتھ آیا اور اسی میں وہ خواجہ سرا، "**مانک**" یا **ملک کافور** (ہزار دیناری) بھی تھا جو چند سال بعد فاتح دکن کی حیثیت سے عہد علائی کا سب سے نامور سپہ سالار ہوا۔

مغلوں کا دوسرا حملہ

اس فتح کے ساتھ رائے کرن کی ریاست سلطنت دہلی کا جزو بن گئی لیکن معلوم ہوتا ہے گجرات کے شمال مغربی اضلاع نیز کچھ پر مسلمانوں کا پوری طرح عمل دخل نہیں ہوا[1] اور نہ وہ ابھی تک راجپوتانے کی ان ریاستوں کو فتح کر سکے جو پہلے سے آزاد تھیں یا محکوم ہونے کے بعد دوبارہ آزاد ہو گئی تھیں۔ فتح گجرات کی اس تکمیل میں دیر کا سب سے قوی سبب، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، مغول کے حملے تھے، جنھوں نے اسی زمانے میں پہلے سندھ اور پھر براہ راست پائے تخت دہلی پر دوبارہ فوج کشی کی (۶۹۷ھ / ۱۲۹۸ء)

ان میں سے پہلی مرتبہ انھوں نے شمالی سندھ کے بعض قلعوں پر قبضہ کر لیا تھا، وہیں ظفر خاں نے انھیں شکست دی اور گھیر کر بڑے بڑے سرداروں کو گرفتار کر لیا۔

[1] یہ قیاس حال کی تحقیقات پر مبنی ہے کیونکہ ہمعصر فارسی تاریخوں میں اس کے متعلق کافی صراحت نہیں کی گئی۔ (دیکھو امپی ریئل گزیٹیر جلد یازدہم صفحہ ۸۷۔ ہسٹوری کل اٹلس اوف انڈیا صفحہ ۱۰ بحوالہ بمبئی گزیٹیر وغیرہ)

۱۳ب

لیکن اس کے بعد ہی ماوراءالنہر کے مغل شہزادے **قتلغ خواجہ** نے جس وسیع پیمانے پر لشکر کشی کی اس نے چنگیز خانی سیلاب کی یاد کو تازہ کر دیا اور معلوم ہوتا تھا کہ اس دفعہ کی طغیانی میں بلادِ ہند کی خیر نہ ہوگی۔ زیادہ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ اس مرتبہ مغل خونخوار قزاقوں کی طرح نہیں آئے بلکہ اس شان سے بڑھ رہے تھے گویا خاص اپنے ملک میں سفر کر رہے ہیں۔ راستے میں انھوں نے کسی شہر کو تاراج و پامال نہیں کیا بلکہ سیدھے دہلی تک چلے آئے اور شمال میں دریا کے کنارے تک پہنچ کے تین طرف سے شہر کی ناکہ بندی کر لی۔

یہی موقع ہے جس میں مختلف اقطاع کی سپاہ اور مضافاتِ شہر کے پناہ گزینوں کی وجہ سے دہلی میں اتنے آدمی بھر گئے کہ رہنے کی جگہ نہ ملتی تھی اور اجناس گراں ہو گئی تھیں۔ دوسرے مغلوں کی دلیری نے بعض امرائے دہلی کو خوف زدہ کر دیا اور ان میں سے ایک نے خلوت میں بادشاہ کو صلاح بھی دی کہ جس طرح ممکن ہو، روپیہ دے کر اس بلا کو ٹال دیا جائے۔ لیکن علاءالدین خلجی نے اس مشورے کو قبول نہ کیا اور شہر پناہ کے باہر نکل کے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا۔ اور یہ فیصلہ محض جوشِ تہور کی بنا پر نہ تھا بلکہ فرشتہ کی روایت کے بموجب، شمار میں بھی دہلی کی فوج زیادہ تھی[1] اور اس کو لڑانے والے ظفر خاں، الغ خاں، نصرت خاں اور غازی ملک جیسے آزمودہ کار سپہ سالار تھے جنھوں نے پہلے بھی مغلوں کو شکست دی اور بڑے بڑے معرکوں میں نام کیا تھا۔

دہلی کی سب سے بڑی جنگ

مورخ فرشتہ تحریر کرتا ہے کہ مسلمانوں کے زمانے میں اس کے وقت تک "کہ تاریخ ہجری بہ ہزار و پانزدہ رسیدہ است" ہندوستان میں اتنی بڑی کوئی لڑائی نہیں ہوئی کہ جس میں فریقین کی سپاہ پانچ لاکھ سے بھی زیادہ تھی۔ اور اس تاریخی شہادت میں اتنا اضافہ کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ اس کے بعد بھی، پانی پت کی تیسری لڑائی کے سوا، تاریخ ہند میں اور کسی جنگ کا پتا نہیں چلتا جس میں

---

[1] فوج مغول کا شمار سب نے دو لاکھ بتایا ہے مگر دہلی کی سپاہ میں بقول فرشتہ تین لاکھ صرف سوار تھے۔ (صفحہ ۱۰۴) نیز دیکھو برنی صفحہ ۲۵۴ وغیرہ۔

لڑنے والوں کا شمار مذکورہ بالا تعداد کے قریب پہنچ گیا ہو۔ لیکن ہندوستان میں قدیم فن حرب کو اسلامی حکومت نے جو ترقی دی، اس کی نظیر میں خاص طور پر قابل ذکر بات یہ نظر آتی ہے کہ دہلی کے حربی ماہروں نے ہندوستان کے جنگی ہاتھیوں کو فی الواقع نہایت کارآمد شے بنا دیا تھا اور انھیں سوار فوج کے ساتھ لڑنے کے واسطے اس طرح سدھانے لگے تھے کہ پیل و اسپ کا متحدہ حملہ روکنا غنیم کو دشوار ہو جاتا تھا۔ واضح رہے کہ مغل حملہ آور اس "بلائے سیاہ" سے ناواقف نہ تھے اور ان کی جرأت و گریز پائی میں بھی کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ لیکن جس وقت ظفر خاں، کہ شجاعت و قوت میں رستم عصر کہلاتا تھا، فوج میمنہ کو لے کر آگے بڑھا اور اس کے جنگی ہاتھیوں کے خوف ناک حملے کے ساتھ ہی سواران دہلی گھوڑے اڑا کر دشمن پر جا پڑے تو مغول کا بایاں بازو (یعنی میسرہ) اپنی جگہ پر قائم نہ رہ سکا۔ اس کی صفیں ٹوٹ گئیں اور ان کے پیچھے ہٹتے ہی ظفر خاں نے اس طرح گھیر کر دبایا کہ وہ مغلوں کے قلب سے جدا ہو کر دور ہوتا چلا گیا۔ ظاہرا مغل سرداروں کی ساری کوشش اب یہ تھی کہ جس طرح ممکن ہو اس گھیرے سے اپنی صفیں نکال کر اصلی لشکر سے جا ملیں لیکن ظفر خاں کے پیہم حملے انھیں صف بندی اور جم کر لڑنے کی فرصت نہ دیتے تھے۔ سواران دہلی انھیں ڈھکیل ڈھکیل کر قتل کر رہے تھے۔ ان کا بہادر سپہ سالار ہر خطرناک مقام پر سب سے آگے نظر آتا تھا اور اس خونخوار شکاری کی شکل دیکھ کر مغل سہمے جاتے تھے۔ دیر تک یہی صورت جنگ قائم رہی۔ عام روایت کے بموجب، مغلوں کی فوج کو ظفر خاں بھگاتا اور مارتا ہوا چھتیس میل تک پیچھے ہٹا لایا اور ان کا بے حد نقصان ہوا۔ لیکن خود ظفر خاں کی اپنے تہوّر اور دلیری کی وجہ سے آخر جان گئی اور وہ ایک جگہ غنیم کے نرغے میں گھر کر گھوڑے سے گرا اور آخری دم تک، پیادہ لڑتا ہوا مارا گیا[1]۔

بے شبہہ ظفر خاں کی شمشیر زنی کا سکہ بیٹھ گیا جسے فارسی مورخوں نے شاعرانہ

---

[1] برنی نے اس لڑائی کے حالات خاصی تفصیل سے مگر بُری طرح بیان کیے ہیں (صفحات ۲۵۹ وغیرہ) اور بعد کی فارسی تاریخوں میں گھٹا بڑھا کے غالباً اسی کی عبارت کو نقل کر دیا ہے۔

باب ۳

آب وتاب کے ساتھ بیان کیا ہے۔ لیکن قیاس کہتا ہے کہ مغل سپہ سالار کو حریف کی کثرت سپاہ دیکھ کر بھی اپنی فتح سے مایوسی ہوگئی۔ وہ راتوں رات دہلی سے تیس میل ہٹ گیا اور پھر جس قدر جلد ممکن ہوا لمبی لمبی منزلیں کرتا ہوا اپنی فوج کو ہندوستان سے واپس لے گیا۔ ۶۹۷ھ / ۱۲۹۷ء

فتوحات راجپوتانہ

ہندوستان میں اس فتح نمایاں کی گھر گھر خوشیاں منائی گئیں سرکاری طور پر بہت دن تک خوشی کے جشن، عیش وطرب کے جلسے ہوتے رہے۔ حکومت علائی کی وقعت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی اور خود بادشاہ کے دل میں اپنی اقبال مندی دیکھ کر ناز وغرور کے جذبات پیدا ہونے لگے۔ وہ محض ان پڑھ سپاہی زادہ تھا اور اگر اتنی بڑی سلطنت اور قوت وثروت پاکر خوشی میں آپے سے باہر ہوگیا، تو کچھ حیرت کی بات نہ تھی۔ ارباب دول کے خود غرض خوشامدی ایسے موقعوں کی تاک میں رہتے ہیں انھوں نے اور بڑھاوے دینے شروع کئے اور اب علاء الدین کو نشے کی ترنگ میں دور دور کی سوجھنے لگی۔ چنانچہ کبھی تو وہ ایک نیا دین جاری کرنے کا منصوبہ باندھتا اور کبھی سکندر اعظم کی طرح ساری دنیا کو فتح کرنے کی تدبیریں سوچتا تھا۔ لیکن جب ہوش کی حالت میں بھی اسی قسم کے کلمات اس کی زبان پر آنے لگے تو مصاحبوں نے سمجھایا کہ مذہب جاری کرنا بادشاہوں کا کام نہیں، دوسری قسم کے لوگوں کا کام ہے۔ خدا یہ خدمت اپنے برگزیدہ پیغمبروں سے (علیہم السلام) لیتا ہے اور وہی اس کا پیام دنیا کو پہنچاتے رہے ہیں اور عقاید اسلامی کے بموجب حضرت محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) خاتم الرسل ہیں آنحضرت صلعم کے بعد کسی نئے پیغمبر کی ضرورت نہیں اور خدا کی طرف سے کوئی جدید مذہب جاری نہ ہوگا باقی رہا ساری دنیا کو فتح کرنا، تو مناسب یہ ہے کہ اس قدر دشوار کام کا بیڑا اٹھانے سے پہلے سلطان ممالک ہند پر تسلط حاصل کرے اور مالوے اور راجپوتانے کے وہ علاقے جو آزاد ہیں، یا آزاد ہوگئے ہیں، انھیں حکومت دہلی کا مطیع بنانے کے بعد، دوسری طرف متوجہ ہو۔

رنتھنبور وجھاین

یہ نصیحتیں سن کر سلطان اپنی خام خیالی سے باز آگیا اور اس نے سب سے پہلے فتح رنتھنبور پر توجہ کی جس کے استحکام کا حال کئی جگہ ہماری نظر سے گزر چکا ہے۔

باب ۳

اس فتح میں دشواریاں دیکھ کر ہی صلح پسند جلال الدین محاصرے سے دست بردار ہو گیا تھا اور ظاہر ہے کہ اس واقعے نے باغیوں کی ہمت اور بھی مضبوط کر دی ہو گی دوسرے رنتھنبور کے قریب[1] غالباً اسی زمانے میں ایک اور قلعہ جھاین بھی تعمیر ہو گیا تھا جس نے رنتھنبور کی جنگی قوت کو بڑھا دیا اور اس کی فتح پیشتر سے بھی زیادہ دشوار ہو گئی۔ چنانچہ پہلی مرتبہ جو فوج الغ خاں کی ماتحتی میں بھیجی گئی تھی (۶۹۹ھ / ۱۲۹۹ء) اسے خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی اور خود سلطان کو تازہ فوج لے کر ادھر جانا پڑا۔ علاء الدین کے مقام جنگ تک پہنچتے ہی محاصرین میں نئی روح پیدا ہو گئی۔ جھاین اور جنوب مشرقی راجپوتانے کا قریب قریب وہ علاقہ جہاں آج کل بوندی اور کوٹہ کی ریاستیں ہیں، افواج دہلی کے قبضے میں آ گیا۔ محصور قلعے میں دشمن کی آمد و رفت رو گئے اور فصیلوں کو توڑنے کی کارروائی زور شور سے ہونے لگی۔ بایں ہمہ قلعے کی تسخیر میں بہت دیر ہوئی۔ بہادر راجپوتوں کے علاوہ رنتھنبور میں سلمان مغلوں کا بھی ایک دستہ راجہ کی طرف سے لڑ رہا تھا۔ دراصل یہ لوگ مہم گجرات میں لشکر سلطانی کے ساتھ تھے لیکن واپسی میں انھوں نے سپہ سالار الغ خاں سے بغاوت کی اور بھاگ کے رنتھنبور میں جا بسے تھے۔ آخر دو سال سے زیادہ عرصے کے محاصرے کے بعد دہلی کی فوج رنتھنبور میں گھس گئی اور سخت کشت و خون کے ساتھ قلعہ فتح کر لیا۔ (۷۰۱ھ / ۱۳۰۲ء)[2]

بعض بغاوتیں، فساد اور انسدادی قوانین۔

لیکن اس تین سال کے دوران میں چار فساد برپا ہوئے جس سے قیاس ہوتا ہے کہ کم سے کم طبقۂ اعلیٰ کا ایک گروہ علاء الدین سے بیزار تھا۔ ان میں تین بغاوتیں تو خود بادشاہ کے بھتیجے بھانجوں نے کی تھیں مگر آخری فساد خاص پایۂ تخت میں ایک غلام نے برپا کیا اور کوتوال شہر کو مار کے ایک شخص کو جبراً تخت پر بٹھا دیا۔ جس کا نسب

---

[1] دیکھو ٹاڈ، جلد سوم، حاشیہ صفحہ ۱۰۲۔ اب اس قلعے کا ٹھیک پتا نہیں چلتا۔ ملا عبد القادر کے زمانے میں اسے "نوشہر" کہتے تھے (منتخب التواریخ، صفحہ ۱۹۰) لیکن معلوم ہوتا ہے بعد میں یہ بالکل ویران و بے نشان ہو گیا۔

[2] سنہ میں کسی قدر شبہہ ہے۔ (دیکھو فرشتہ صفحہ ۱۰۰) لیکن ضیاء الدین برنی کے ایک فقرے سے ضمناً ثابت ہوتا ہے کہ یہ مہم تقریباً تین سال میں سر ہوئی (برنی صفحہ ۲۷۹)۔

اسباب

ان کی طرف سے سلطان شمس الدین التمش تک پہنچتا تھا۔ مقامی حکام نے یہ سب شورشیں خود ہی فرد کرلیں اور سلطان کو رنتھنبور سے آنے یا فوج لانے کی بھی ضرورت نہیں پڑی لیکن یہ فکر ضرور پیدا ہوگیا کہ آئندہ کیا تدابیر اختیار کی جائیں کہ کسی کو ایسا فساد بپا کرنے کی جرأت نہ ہو۔ برنی لکھتا ہے کہ گو محاصرے کی کارروائی شدومد سے جاری تھی مگر سلطان رات دن اپنے امراسے جن کی اصابت رائے مشہور تھی اسی مسئلے کے متعلق مشورے کرتا رہتا تھا۔ آخر بہت کچھ غور و بحث کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ حکومت کی لوگوں کے ذاتی معاملات سے بے خبری، رعایا کی دولت مندی، شراب خواری اور باہمی قرابت و دوستی کے ذریعے امرا کی فرقہ بندی، شورش و سازش کے (چار) اصلی اسباب ہیں اور جب تک انھیں دور نہ کیا جائے گا، اس وقت تک برابر فساد بپا ہونے کا اندیشہ رہے گا۔

یہ رائے صحیح تھی یا غلط، اس میں شک نہیں کہ جب اس کے مطابق بادشاہ کی طرف سے نئے نئے قوانین جاری ہوئے تو رعایا خاص کر دولت مند طبقے کے بے کار افراد کو بہت تکلیف اٹھانی پڑی۔ اول تو بہت سی جاگیریں، انعامات، معافیاں وغیرہ جو "زائد از ضرورت" سمجھی گئیں، سرکار نے ضبط کرلیں دوسرے زرستانی کے بعض نئے ابواب بڑھا دیئے گئے۔ پھر قمار بازی، شراب خواری اور نیز نشے کی اور چیزوں کا استعمال خلاف قانون قرار دیا گیا۔ سلطان نے سب سے پہلے خود شراب خواری سے توبہ کی اور شاہی کارخانے میں میگساری کے جس قدر ظروف تھے، سب تڑوا دیئے۔ پھر شراب بیچنے اور پینے کی ایسی سخت سزائیں مقرر کیں کہ اگر یہ بری عادت بالکل دور نہ ہوسکی ہو تو کم سے کم مسکرات کی علانیہ خرید و فروخت ضرور موقوف ہوگئی۔

اُمرا کے اندرونی حالات سے واقفیت اور سیاسی سازشوں کے انسداد کی نئی نئی تدبیریں نکالی گئیں اور غالباً اسلامی بادشاہوں میں علاءالدین پہلا فرماں روا ہے جس کے عہد میں خفیہ پولیس یا جاسوسی کا ایک باضابطہ محکمہ بنا اور یہ طریقہ جاری ہوا کہ اُمرا بغیر بادشاہ کی اطلاع کے نہ باہم شادی بیاہ کرسکتے تھے نہ زیادہ میل جول بڑھا سکتے تھے اور یہ مطلق العنان بادشاہی کی وہ شان تھی کہ آیندہ مغل سلاطین کے

باب ۳

عہد میں بھی رہیں اس کا جلوہ نظر آئے گا۔[۱]

مالگزاری و بندوبست

اسی ضمن میں محکمۂ مالگزاری کی بھی اصلاح کی گئی اور بہت سے پرانے عہدہ دار جو رشوتیں لیا کرتے تھے، یک قلم برخاست کر دیئے گئے۔ پھر دوآب سے دیالپور تک اور چھاین سے لاہور تک تمام علاقے کی پیمائش اور تشخیص کی گئی۔ نائب وزیر ممالک شرف قائی نے جو اپنی قابلیت کے اعتبار سے "در چنیں ملکتے نظیر خود نہ داشت" خود ایک ایک گاؤں کی جمعبندی کا ملاحظہ کیا اور کئی سال کی محنت کے بعد چرائی اور مالگزاری کی رقوم معین کیں۔[۲] ہر جگہ کے لیے تشخیص مالگزاری کا ایک اصول قرار دیا گیا تھا کہ کاشت کار سے نصف پیداوار سرکار لے لیگی اور غالباً چرائی کے نام سے جو محصول (شیر آور) گائے بھینس پر لیا جاتا تھا وہ اس کے علاوہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اصول بہت سخت تھا اور مورخ کے الفاظ میں اس پر عملدرآمد کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ "تمرد و عصیان و اسپ سوار شدن و سلاح بر دست گرفتن و جامۂ خوب پوشیدن و تنبول خوردن از چودھریاں و خوطان (؟) و مقدمان بکلی برفت" لیکن اگر یہ شہادت بے کم و کاست مان لی جائے تو بھی ظاہر ہے کہ اگر بادشاہ نے وہ دولت زمینداروں سے چھین کر اپنے خزانے میں بھر لی تھی، تو بھی وہ ہندوستان ہی میں رہی اور زیادہ تر یہیں کی شاہی عمارت یا فوجی ضروریات میں خرچ ہوئی۔

مہم کے بعد فتح چتوڑ

دوسرے درحقیقت اب حکومت دہلی نے گجرات و مالوہ کو صحیح معنی میں سلطنت کا

---

[۱] ضیاء الدین برنی نے ان واقعات کو بہت تفصیل سے لکھا ہے (۲۸۲ تا ۲۸۹) لیکن کہیں کہیں شاعرانہ مبالغے کے علاوہ ہر جگہ اس کی ذاتی ناپسندیدگی ظاہر ہوتی ہے حالانکہ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ "قوانین" ایسے نامعقول اور تکلیف دہ نہ تھے، جیسا کہ مورخ نے دکھانے کی کوشش کی ہے۔

[۲] اس بندوبست اور مالگزاری کے نئے قوانین کے نفاذ کے لیے ملاحظہ ہو، برنی صفحہ ۲۸۸ وغیرہ ہندوستان کی "مستند" اور تازہ ترین انگریزی تاریخ (اوکسفورڈ ہسٹری) میں ان قوانین پر سلطان علاء الدین کو ظالم و وحشی وغیرہ بہت سخت الفاظ سے یاد کیا ہے (صفحہ ۲۳۴) تعجب ہے لائق مولف کو جو عرصے تک ہندوستان میں رہے تھے یہ خیال نہیں آیا کہ اس زمانے میں بھی جب کہ خود ان کی شائستہ قوم ہندوستان پر حکمراں ہے اور بقول ان کے ملک کہیں زیادہ دولتمند اور آسودہ حال ہے، ایسے کتنے گاؤں ہوں گے جہاں کے چودھری یا نمبردار "اسپ و سلاح" کے مالک رہے ہوں

باب ۲

جزو بنانے کا تہیہ کر لیا تھا اور اس کے لیے جنوبی راجپوتانے کی فتح مقدم شے نظر آتی تھی۔ قیاس چاہتا ہے کہ رنتھنبور کے طویل محاصرے نے شاہی خزانے کو خالی کر دیا تھا اور اب پہلے سے بھی زیادہ غیر آباد علاقوں میں فوج کی رسد اور سامان آسائش فراہم کرنے کے واسطے زر کثیر کی ضرورت تھی۔ دکن کا خیال بھی سلطان علاء الدین کے ذہن سے نہیں نکلا تھا چنانچہ اس موقع پر جو لشکر مرتب ہوا، اس کے ایک حصے کو اس نے جاج نگر کی طرف سے دکن جانے کا حکم دیا، اور باقی فوج سے خود چیتوڑ پر فوج کشی کی ۱۳۰۳ء۔

جس قدر تاریخی یا نیم تاریخی شواہد موجود ہیں، ان سے پتا چلتا ہے کہ جنوبی راجپوتانے کی یہ ریاست ہندو رجواڑوں میں قدیم سے بہت معزز مانی جاتی تھی اور مسلمانوں کی زد سے بھی اب تک محفوظ تھی۔ کرنیل ٹاڈ نے علاء الدین کی لڑائیوں کے متعلق جو قصے لکھے ہیں انھیں پڑھ کر یہ قدرتی قیاس اور قوی ہو جاتا ہے کہ منچلے راجپوتوں نے جانبازی دکھانے میں بھی کمی نہیں کی لیکن آخر کار انھیں شکستیں کھا کر محصور ہونا اور ہتھیار ڈال دینے پڑے۔ چیتوڑ پر حکومت دہلی کا قبضہ ہو گیا اور وہاں سلطان نے اپنے بڑے بیٹے خضر خاں کو صوبہ دار بنا دیا۔

پدمنی کا فسانہ

آخری روایت فرشتہ کی ہے (صفحہ ۱۱۱) اور اسی نے بعض اور تفصیلی واقعات کے ساتھ پدمنی کا قصہ بھی کسی ہمعصر تاریخ کا حوالہ دیے بغیر نقل کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ چیتوڑ کا راجہ رتن سین اسیر ہو کر دہلی لایا گیا تھا۔ اسے سلطان نے پیام دیا کہ اگر اپنی بیٹی (پدمنی) کو جو اس کے مفرور اہل خاندان کے ساتھ پہاڑوں میں پناہ گزیں تھی محل سرائے شاہی میں داخل کرنے پر آمادہ ہو تو اسے رہا کر دیا جائے گا۔ راجہ نے اس تجویز کو قبول کر لیا اور قاصد بھیج کر پدمنی کو دہلی طلب کیا۔ لیکن اس کے خاندان والوں کو یہ عار گوارا نہ تھی اور اس لیے انھوں نے پدمنی کی بجائے بہت سی پالکیوں میں راجپوت سپاہی بھیج دیئے اور مشہور کیا کہ اس میں وہ اور اس کی سہیلیاں سوار ہیں۔ اس بہانے سے انھیں قلعے میں جہاں راجہ قید تھا داخل ہونے کی اجازت مل گئی اور انھوں نے اندر پہنچتے ہی یک بہ یک باہر نکل کے نگہبانوں پر حملہ کیا اور جس طرح

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:- اور عمدہ لباس پہنتے اور پان کھاتے ہوں!

اسلہ

ممکن ہوا راجہ کو بچا کرلے گئے (تاریخ فرشتہ۔ صفحہ ۱۱۵)

۔ خلاف قیاس ہونے کے علاوہ، اس قصے کا برنی کی مفصل تاریخ میں مذکور نہ ہونا ہی اسے مشتبہ بنا دینے کے لیے کافی ہے۔ الفنسٹن ایک طرف، ونسنٹ اسمتھ جیسا مولف بھی جس نے ظاہرا اسلامی فرماں رواؤں کو بجا و بیجا بدنام کرنا اپنی تاریخ کا ضروری مقصد قرار دیا ہے، اس بارے میں سکوت اختیار کرتا ہے۔ دوسرے ٹاڈ کا بیان ہے کہ جب قلعۂ چتوڑ کے بچانے سے ناامیدی ہوئی تو راجپوتوں نے رسم قدیم (جوہر) کے مطابق اپنے تمام اہل و عیال کو جمع کر کے جلا دیا اور خود بھی لڑ کر مر گئے۔ غرض یہ افسانہ جسے آج کل بعض انگریزی "تاریخوں" میں بہت آب و تاب کے ساتھ لکھا جاتا ہے، محض "شاعری" ہے۔

طرغی مغل کا حملہ۔

چتوڑ کی فتح کا مقصود صرف مالوے اور گجرات کے راستے محفوظ کرنا تھا۔ ورنہ بذاتہ جنوبی راجپوتانے کے قبضے سے کسی مالی فائدے کی امید نہ تھی۔ ادھر ایک وفادار و مطیع راجہ کو وہاں حاکم بنا دینے سے مذکورۂ بالا مقصد حاصل اور دہلی کے خلاف کسی خاص شورش کا اندیشہ زائل ہو گیا؛ دوسرے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان کا چتوڑ کی فتح میں منہمک ہونا سن کر ہی مغلوں کو دوبارہ دہلی پر تاخت کرنے کا موقع مل گیا اور ان کا مشہور سپہ سالار طرغی نہایت تیز کوچ کرتا ہوا پائے تخت کے قریب آپہنچا (۷۰۳ھ / ۱۳۰۳ء) اور اگرچہ دو مہینے کے محاصرے کے بعد مغلوں کو ناکام واپس جانا پڑا، لیکن شاید اس واقعے نے بھی حکومت دہلی کو متنبہ کر دیا کہ وہ کم سے کم کچھ عرصے کے واسطے اپنی بیرونی ذمہ داریاں بڑھانے میں احتیاط کرے۔ کیونکہ گو سلطان چتوڑ سے واپس آ گیا تھا، لیکن مغلوں کی آمد کے وقت سلطانی افواج اس قدر بٹی ہوئی تھیں کہ دہلی کی باقی ماندہ فوج حملہ آوروں کے بارہ تمن (یعنی ایک لاکھ بیس ہزار) سواروں کا بھی میدانی مقابلہ نہ کر سکتی تھی اور سلطان کو قلعہ بند ہو کر مدافعت کے سوائے کوئی چارہ نہ رہا تھا۔ شہر کے لوگوں کو اس محاصرے سے بہت پریشانی اور تکلیف تھی لیکن مغلوں نے جب کبھی شہر کے کسی حصے میں گھسنے کا ارادہ کیا، انھیں ناکامی ہوئی اور دہلی کے سپاہ نے کئی بار مدافعت کا حق ادا کر دیا۔ لہٰذا حملہ آور جو رسد رسانی کی دقتوں کے علاوہ بظاہر

سلہ۔ برنی صفحہ ۳۰۲۔

ایک غیر ملک میں عرصے تک بے کار پڑے رہنے سے گھبرا گئے تھے اور جن کا خاص مقصد پچھلی شکست کا داغ مٹانا تھا، اسی تیزی سے واپس چلے گئے۔[۱]

فوجی تنظیم اور نرخ اجناس کا تعین۔

لیکن اس واقعے نے اور مہم رنتھنبور و چتوڑ کی مشکلات نے سلطان کے سکندری ولولوں کو بہت کچھ سرد کردیا اور اب اسے صاف نظر آگیا کہ جب تک فوجی تعداد اور جنگی ساز و سامان میں خاطر خواہ اضافہ نہ کیا جائے گا، دنیا کی فتح ایک طرف خود اپنے ملک میں بھی مغلوں کے خوف سے اطمینان میسر نہ آئے گا۔ پس ملکی مداخل و مصارف کی بڑی اہتمام سے جانچ پڑتال کی گئی اور فوج میں اضافۂ کثیر کی نہایت مفصل تجاویز مرتب ہوئیں جن سے، دیگر جنگی ضروریات کو پیش نظر رکھنے کے ساتھ، خاص طور پر یہ انتظام کرنا منظور تھا کہ فوج والوں کو جو تنخواہ دی جائے اس میں وہ بہ آسانی اپنا گزارہ کرسکیں۔ اس غرض کے لیے کھانے پہننے، برتنے کی ہر شے کے سرکاری نرخ مقرر کئے گئے اور اجناس خوردنی، کپڑا، برتن، گائے بھینس، گھوڑے غرض غالباً کوئی استعمالی شے ایسی نہ تھی جو اس ہمہ گیر قانون کے احاطے میں نہ لے لی گئی ہو۔ دوسرے جابجا بڑے بڑے سرکاری انبار غلے قائم کردیے گئے جن میں ہر قسم کا غلہ بھرا رہتا تھا کہ قحط و خشک سالی کے زمانے میں بھی مقررہ نرخ بدلنے کی ضرورت نہ پیش آئے اور ہمعصر مورخ شہادت دیتا ہے کہ سلطان علاء الدین کے جیتے جی اس نرخ و ارزانی میں کوئی فرق نہیں آیا جو درحقیقت اس بادشاہ کی

---

[۱] اس تشویش ناک محاصرے کے زمانے میں سلطان نظام الدین اولیاؒ سے بھی دعا کی درخواست کی گئی تھی اور مغلوں کی بے جنگ و شکست پسپائی کو لوگوں نے آپ ہی کے روحانی تصرف پر محمول کیا اور ہمعصر مورخ نے بھی اسی عقیدے کو تحریر کردیا جس پر ونسنٹ اسمتھ صاحب یہ "بدگمانی" کرتے رہیں کہ حکومت دہلی کی جانب سے کوئی رشوت یا نذرانہ دیا گیا ہوگا کہ مغل حملہ آور واپس چلے گئے! (صفحہ ۲۴۲) لیکن اول تو برنی جو عہد علائی کی ہر کمزوری یا خرابی کو تفصیل بلکہ مبالغے سے بیان کرتا ہے، اس قسم کی کارروائی سے بے خبر نہ رہ سکتا تھا دوسرے اسمتھ صاحب اگر غور کرتے تو انھیں بلا دقت اس پسپائی کے بہت سے ظاہری اسباب اور قوی قرائن بھی مل جاتے۔

ایک

حیرت انگیز انتظامی قابلیت کا ثبوت ہے[۱]۔

نرخوں کے اس تعین کی نگرانی کے لیے عمولی پولس کے علاوہ ایک بہت بڑا محکمہ قائم ہوا بڑی منڈی میں سرکاری شحنہ مقرر کیے گئے جن کی سختی نے تھوڑے ہی عرصے میں ہر قسم کے تجارت پیشہ لوگوں کو نئے ضوابط کا پابند بنا دیا اور پھر سلطان کو فوج کی از سر نو تنظیم اور اضافہ کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ چنانچہ اس نے پائے تخت اور دیگر مقامات میں بہت سے قلعے اور جنگی مورچے تعمیر کئے اور چار لاکھ بچھتر ہزار سوار کی وہ جرار فوج مرتب کی جس نے مغلوں کو شکستیں دینے میں سپاہ تیلینی کی شہرت کو ماند کر دیا۔ ان سواروں کی عام تنخواہ ۱۳ - اور دو اسپہ کی ۱۹ ½ تنکہ (یا روپیہ) ما ہانہ تھی اور اسی میں ان کے اہل وعیال نیز اسپ و اسلحہ کے مصارف بخوبی پورے ہوجاتے تھے[۲]۔

دکن کی فتوحات

اس نئی فوج نے دو ہی سال میں مغلوں کو ایسی سخت شکستیں دیں کہ ۷۰۳ھ کے آخری بڑے حملے کے بعد مدت تک انھیں ہندوستان کا رخ کرنے کی جرات نہیں ہوئی اور کئی بار ان کے ہزارہا سپاہی مارے گئے اور فوجیں کی فوجیں اس طرح معدوم ہوئیں کہ ان میں سے ایک شخص بھی زندہ پھر کر نہ گیا۔ ان معرکوں میں سب سے زیادہ شہرت ملک کافور اور غازی ملک تغلق نے پائی جو آخر میں سلطنت دہلی کا بادشاہ ہوا[۳]۔

---

[۱] ان تمام قوانین یا ضابطوں کا ضیاء الدین برنی نے تفصیل سے حال بیان کیا ہے جس سے اس زمانے کے اقتصادی حالات کا بھی بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے (صفحات ۳۰۴ تا ۳۲۰)

[۲] برنی صفحہ ۳۰۳ و ۳۱۹ - یہ عبارت مشتبہ ہے اور فرشتہ نے مذکورۂ بالا نرخوں کے علاوہ آخری شرح تنخواہ ۶ ½ تنکہ لکھی ہے (صفحہ ۱۱۴) جو راقم الحروف کے قیاس کے مطابق محض دو اسپہ کو بطریق اضافہ ملتا تھا (۱۳ + ۶ ½ = ۱۹ ½) بلوخ مین اور میجر فلر برنی کی عبارت کا ٹھیک مطلب نہ سمجھ سکے اور الیٹ نے غور و بحث کے بعد یہ قیاس کیا کہ اصل تنخواہ ۱۹ ½ اور ۶ ½ تنکہ دو اسپہ کے واسطے اضافہ تھا۔ (الیٹ جلد سوم صفحہ ۱۹۵) لیکن وہ اگر فرشتہ کے قول سے اصل عبارت کا مقابلہ کرتے تو غالباً مذکورۂ بالا نتیجے پر پہنچ جاتے ۱۲

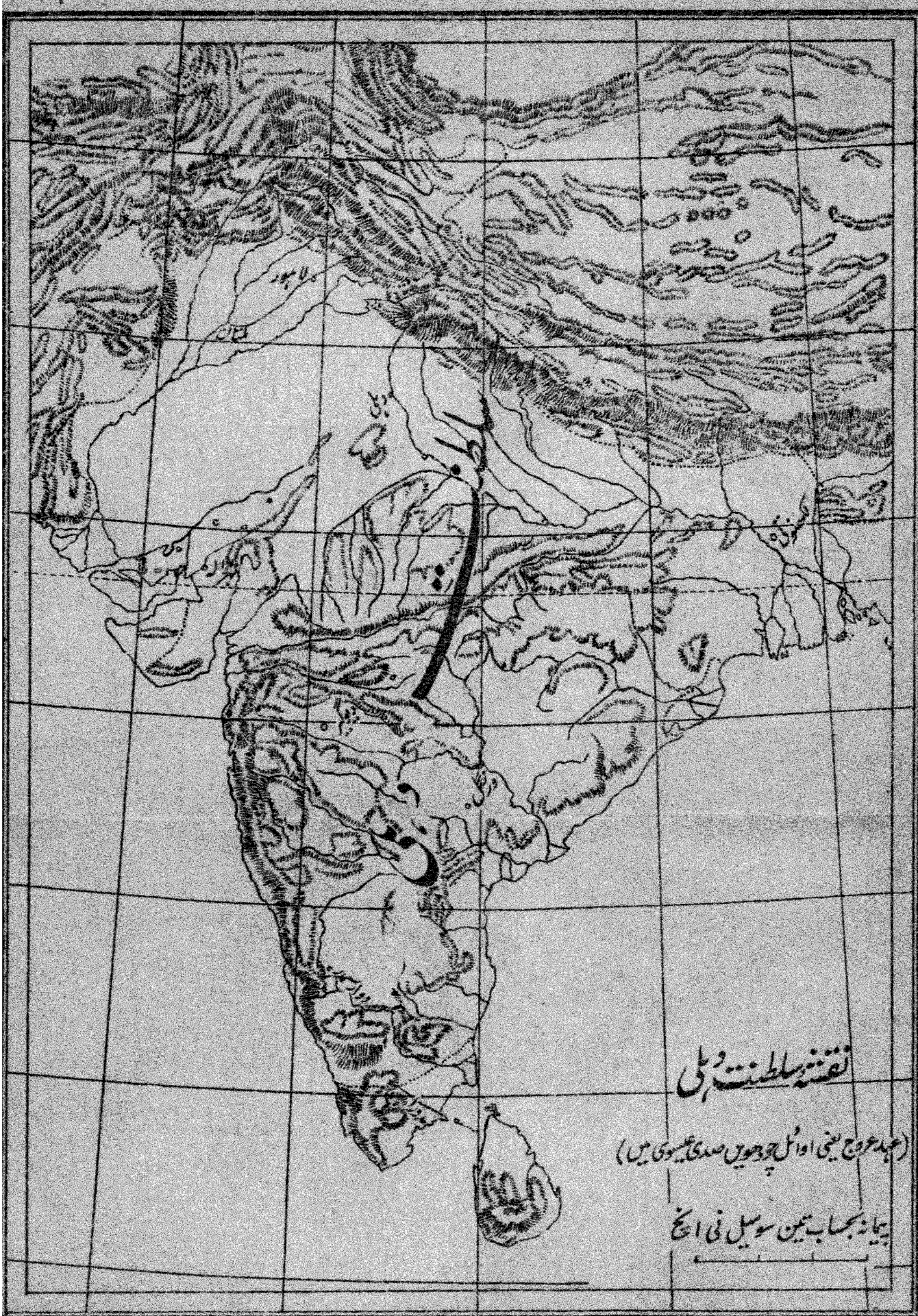
[۳] مغلوں پر ہندوستانی فوج کا اس درجہ ہراس طاری ہوگیا تھا کہ پھر وہ ہندوستان کی سرحد (یعنی

باب ۴

اس دوران میں عین الملک نے مالوے کو از سرِ نو فتح کر کے اس علاقے کا سلطنت سے الحاق اور آئندہ دکن پر پیش قدمی کا راستہ صاف کر دیا تھا[۱] جس کی سلطان علاء الدین کو بہت دن سے آرزو تھی؛ مگر یاد رکھنا چاہئیے کہ گو آئندہ سات برس میں اسلامی فوجوں نے یکے بعد دیگرے جنوبی ہند پر چار حملے کئے اور دیوگیری، ارنگل (ورنگل) یعنی ریاستِ تلنگانہ دور سمدر (یعنی موجودہ میسور) اور سب سے جنوبی ریاست پانڈیا کا پائے تخت مدورا تک فتح کیا جو دہلی سے تقریباً پونے دو ہزار میل کے فاصلے پر واقع ہے بایں ہمہ ان کے براہِ راست سلطنت دہلی کے ماتحت الحاق کرنے کا ابھی تک خیال نہیں پیدا ہوا تھا اور ان ریاستوں کے رئیسوں کو خراج گزاری کے اقرار پر اپنی جگہ بحال رہنے دیا گیا تھا۔ جس کی ایک وجہ تو ظاہر ہے کہ اس زمانے میں اتنے بعید اور دشوار گزار فاصلوں کا طے کرنا کچھ آسان بات نہ تھی۔ دوسرے درحقیقت، بعض ساحلی بندرگاہوں کے سوا دکن میں ابھی تک مسلمانوں کی کوئی آبادی نہ تھی اور شمالی ہند کے سپاہی زیادہ عرصے تک اپنے گھروں سے دور رہنا گوارا نہ کرتے تھے۔ دکن کے مستقل قبضے میں یہی وہ وقت تھی جسے رفع کرنے کی غرض سے سلطان محمد تغلق نے دہلی کی آبادی کو دیوگیری میں منتقل کیا تھا مگر یہ سلاطین خلجی کے عہد کے بعد کی بات ہے۔ البتہ خلجیوں کا یہی کارنامہ کچھ کم قابلِ داد نہیں ہے کہ سب سے پہلے انھی نے دکن کے بعید ملک فتح کئے اور شمالی ہند سے دکن کا سیاسی تعلق اور تمام برِ اعظم ہند میں ایک مرکزی سلطنت قائم کرنے کا امکان پیدا کر دیا، جو ان سے پہلے محض ایک خیالی اور محال بات تھی۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ کوہ سلیمان تک بھی آنے کی جرأت نہ کرتے تھے۔ ان کی مسلسل شکستوں کے لیے دیکھو برنی صفحات ۳۲۱ تا ۳۲۳۔

[۱] نئے انتظام کی عمدگی کی فرشتہ ان الفاظ میں شہادت دیتا ہے "مزاحمت مغل بالکلیہ برطرف شد و اکثر بلادِ ہندوستان کہ ملاذ و معاذِ مفسدان و متمردان بود بحیطۂ ضبط در آمد و مملکت مالوہ چنانکہ باید مصفا گردید و راہ ہائے آمد و شد تجار و سائر اہلِ سیاحت صورت امنیت پذیرفت" (صفحہ ۱۱۶)۔


لاہور
ملتان
دہلی
نقشہ سلطنت دہلی
(عہد عروج یعنی اوائل چودھویں صدی عیسوی میں)
پیمانہ بحساب تین سو میل فی انچ

باب ۳

دوسری فصل۔ خاندان تغلق

"مطلق العنانی" کی ترقی

سلطان علاءالدین خلجی نے ۷۱۶ھ ۱۳۱۶ء میں وفات پائی۔ ضیاءالدین برنی نے بعض لوگوں کا یہ شبہ بھی نقل کیا ہے کہ شاید ملک کافور نے بیماری میں اس کا کام تمام کردیا۔ بہرحال، گو خلجیوں کے خاندان کو حکومت کرتے تقریباً ایک ربع صدی گزری تھی لیکن اسی عرصے میں بادشاہ کی شخصی قوت میں نمایاں ترقی ہوگئی جو حکومتِ دہلی کے لیے کچھ نیک فال نہ تھی۔ ہمعصر مورخ لکھتا ہے کہ آخری زمانے میں علاءالدین کی یہ حالت ہوگئی تھی کہ اس نے "رائے اور مشورہ لینا بالکل چھوڑ دیا تھا اور چاہتا تھا کہ ساری حکومت اور امارت صرف ایک اس کے گھر میں اور اس کے غلاموں کے پاس آجائے اور تمام کلیات وجزئیات پر صرف اس کا ذاتی حکم نافذ ہو۔"[1]

بے شبہ برنی کی رایوں کو قبول کرنے میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ جابجا اس کی تحریر میں تعصبات کا دخل نظر آتا ہے۔ لیکن غور کرنے سے مذکورۂ بالا قول بالکل قرین قیاس اور صحیح ثابت ہوگا۔ درحقیقت دہلی کی اس طرز حکومت میں جس کا نقشہ غزنی کی "ترک شاہی" کے مطابق تیار ہوا تھا، نمایاں نقص یہی ہے کہ ایک لائق اور اقبال مند بادشاہ اس قدر طاقتور ہوجاتا تھا کہ پھر اسے ارکین سلطنت کی امداد کی پرواہ نہ رہتی تھی اور خود وہ اس کی ذاتی خوشنودی حاصل کرنا ہی اپنی سب سے بڑی کامیابی سمجھنے لگتے تھے۔

عہد علائی کے دو عملیات

جلال الدین اور علاءالدین کی تخت نشینی بھی غیر متوقع اسباب کا نتیجہ تھی اور اس نے شروع ہی میں ان کو قدیم امراسے بدگمان ومستغنی کردیا تھا لیکن جیسا کہ ہم بیان کررہے تھے مطلق العنانی کی تقویت کا بڑا سبب اسی اقبال مندی

[1] برنی صفحہ ۳۳۴۔

باب

اور حیرت انگیز انتظامی قابلیت کو قرار دینا چاہیئے جس نے ایک ان پڑھ سپاہی کو اپنے زمانے کا سب سے بڑا فرماں روا بنا دیا۔ اور واقعات نے اس بات کا برنی جیسے نکتہ چیں مورخ سے بھی اعتراف کرا لیا کہ عہد علائی کی ارزانی،[1] امن وامان مغلوں کے حملوں کا سد باب، رہزنی کا استیصال، سرکشوں اور مفسدوں کی اطاعت، سلطانی افواج کی کثرت و باقاعدگی اور بہترین اسلحہ سے آراستگی، رفیع الشان عمارات کی تعمیر، ہندوستان کی عام رونق اور صدہا علما، شعرا، ہر فن کے استادوں اور ہر ہنر کے ماہروں کا اجتماع[2] — "عجائبات روزگار" میں شمار کئے جانے کے لائق ہیں "کہ آنچناں در ہیچ عہدے و عصرے دیگر مشاہدہ نہ شد و شاید کہ (آئندہ) معائنہ ہم نہ شود"۔

سلطان قطب الدین مبارک شاہ

ان میں بعض "عجائبات" علاء الدین کے بعد تک موجود رہے اگرچہ اوصاف ذاتی کے اعتبار سے اس کے جانشین بیٹے کو باپ سے کوئی نسبت نہ تھی۔ واضح رہے کہ سلطنت کا اصلی وارث شہزادہ **خضر خاں** تھا مگر اسے باپ نے اپنی آخری بیماری میں ناراض ہو کر قلعۂ گوالیار میں نظر بند کر دیا تھا جب علاء الدین مرا تو اس کے محبوب غلام کافور نے، جو کچھ دن سے سلطان کے مزاج اور سلطنت کے کاروبار پر حاوی ہو گیا تھا، سلطان مرحوم کا ایک وصیت نامہ پیش کیا اور اس کی رو سے علاء الدین کے چھوٹے بیٹے **شہاب الدین** کی بادشاہی کا اعلان کر دیا جس کی عمر پانچ چھ سال سے زیادہ نہ تھی۔ پھر اس کے دو بڑے بھائیوں کو حالتِ نظر بندی میں اندھا کرا دیا اور شاید تیسرے کے قتل کی فکر میں تھا کہ محل کے سپاہیوں نے خود اسے مار ڈالا اور قطب الدین (کچھ عرصے چھوٹے بھائی کے سرپرست کی حیثیت سے اور بعد میں اسے ہٹا کر) سلطنت کا مالک ہو گیا۔

۱۳۱۶ تا ۱۳۲۰ء

[1] "اول عجب، ارزانی غلات واقمشہ واسباب معاش بودہ است کہ نرخ آں در امساک باراں کم وبیش نہ شد وتا سلطان علاء الدین زندہ بود استقامت ارزانی در تخلل نیفتاد" (برنی صفحہ ۳۳۹)۔

[2] اس قسم کے بیسیوں منتخب ارباب علم وفن کا مورخ نے نام بنام تذکرہ کیا ہے۔ دیکھو برنی صفحات ۳۳۹ تا ۳۶۲۔

الحاق دیوگیری

نوجوان شہزادے نے تخت نشین ہوتے ہی عہد علائی کے سخت ضوابط منسوخ کر دئے جس کی وجہ سے اجناس کے نرخ تھوڑے ہی دن میں گراں ہوگئے اور غالباً سرکاری آمدنی پر بھی بُرا اثر پڑا۔ بایں ہمہ چونکہ پچھلے عہدہ دار اپنے عہدوں پر بحال تھے اس لیے ملکی نظم و نسق اور فوجی انتظامات میں زیادہ فرق نہ آیا اور گجرات و دکن میں جو شورشیں بپا ہوئی تھیں وہ بہت جلد فرو کردی گئیں۔ ان میں سے گجرات کا سلطنت دہلی کے ساتھ پہلے ہی الحاق ہوچکا تھا اب **عین الملک** نے فسادات کو دفع کرنے کے بعد از سر نو یہاں کے انتظامات کی درستی کی اور ایسے عمدہ مواقع پر فوجی چھاؤنیاں قائم کیں کہ آئندہ اندرونی شورش کا سدباب ہوگیا۔ لیکن سیاسی اعتبار سے زیادہ اہم **ہرپال** راجہ دیوگیری کی بغاوت تھی جس کے ساتھ مہاراشٹر کے بہت سے رئیس شریک ہوگئے تھے سلطان نے اس طرف خود فوج کشی کی۔ باغی راجہ گرفتار ہو کر مارا گیا اور اسی واقعے نے **دیوگیری** کی رہی سہی آزادی کا خاتمہ کردیا۔ (۱۳۱۸ء)

خسرو خاں

شمالی دکن میں جسے برنی کے زمانے میں "ملک مرہٹہ" کہتے تھے، اپنے صوبہ دار و عمال مقرر کرنے کے بعد عیش پسند بادشاہ نے خود پائے تخت کی راہ لی اور اس کی حکومت اور زندگی کے باقی تین چار سال محض عیاشی اور بیہودگی میں صرف ہوئے۔ دکن سے چلتے وقت وہ ملیبار کے سرکشوں کو سزا دینے کے لیے **خسرو خاں** کو جنوبی ہند کی افواج کا سپہ سالار بنا گیا تھا۔ خسرو خاں درحقیقت ایک نومسلم اور کمسن غلام تھا اور نوجوان بادشاہ کو اس کے ساتھ وہی شیفتگی ہوگئی تھی جو اس کے باپ کو ملک کافور خواجہ سرا سے تھی۔ چنانچہ وہ خرابیاں جن کی علاءالدین کے آخر زمانے میں شکایت پیدا ہوئی، خسرو خاں کے عشق کی بدولت قطب الدین کے شروع عہد سے ہی نمودار ہونے لگیں اور کافور کی نسبت تو اپنے ولی نعمت کو قتل کرنے کا محض شبہہ تھا، لیکن خسرو خاں نے بہت سے اختیار حاصل کرنے کے بعد واقعی اپنے آقا کو قتل کرا دیا اور اسی کے ساتھ سلطنت کے بڑے بڑے امیروں کو بھی جو اس وقت پائے تخت میں موجود تھے دھوکا دے کر نظر بند کر لیا۔ (۱۳۲۰ء)۔

باب ۳

خسرو خاں نے اپنی قوم کے ہزاروں ہندو سپاہی پہلے سے دہلی میں بلالیے تھے۔ ایک دو مسلمان امیر بھی جن کی شاہ مقتول نے آبرو ریزی کی تھی، اس قتل کی سازش میں شریک ہو گئے۔ بعض امرا نے روپیہ کے لالچ میں اور بعض نے اصلاح حال سے نا امید ہو کر اس کی اطاعت قبول کرلی اور اس نے ناصر الدین کے لقب سے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ سب کے دل گواہی دے رہے تھے کہ یہ چند روز کی بہار ہے، تاہم خسرو خاں کو اتنی فرصت ضرور مل گئی کہ اس نے علاء الدین اور قطب الدین کی نرینہ اولاد کو چن چن کر قتل کیا اور محلات شاہی میں خون کی ندیاں بہادیں۔ یہ گویا خدا کی طرف سے جلال الدین کے خون ناحق کی سزا تھی کہ علاء الدین کے خاندان کا نام و نشان دنیا سے مٹ گیا۔

خسرو خاں اور اس کے "پرواری" رفیقوں نے تین چار مہینے میں اہل شہر پر جو ظلم و ستم کئے، ان کی تفصیل ناگفتہ بہ ہے مگر سب سے زیادہ سبق آموز اور یاد رکھنے کے لائق یہ بات ہے کہ اہل دہلی کے لیے یہ وحشیانہ حرکات بالکل ہی نئی نہ تھیں بلکہ علاء الدین جوش غضب میں اور اس کا جانشین عالم مستی میں اسی قسم کے زشت و شرم ناک افعال کا بارہا تماشا دکھا چکے تھے پس "شدتِ حرص و طمع دنیا و ضعف ایماں" کی وجہ سے مسلمانوں کا ایک گروہ خسرو کا رفیق ہو گیا[1] تو یہ کچھ حیرت کی بات نہ تھی۔ البتہ ان دونوں حالتوں میں اتنا فرق ہے کہ اس وقت یہ بدعنوانیاں محض اکیلا بادشاہ کرتا تھا اور اس کی عالی خاندانی کا بھی لوگ کچھ نہ کچھ رعب مانتے تھے اور اب خسرو خاں کی برادری کا ہر فرد فرعون بے ساماں بن گیا جس کی جہالت و ناشائستگی، رذالت و کم نسبی سب پر عیاں تھی۔

غازی ملک تغلق۔

مگر خسرو خاں کو سب سے زیادہ خطرہ پنجاب کے صوبہ دار **غازی ملک** تغلق کی جانب سے تھا، جس کی شجاعت و سپہ سالاری کا حال ہم اجمالاً پہلے پڑھ چکے ہیں، خاندان شاہی کی افسوس ناک تباہی سن کر اسے سخت صدمہ ہوا اور وہ غدار خسرو سے انتقام لینے کے لیے بیقرار تھا لیکن خود اس کا بیٹا

---

[1] برنی صفحہ ۴۱۲۔

ملک فخر الدین جونا، کہ آخر میں سلطان محمد تغلق کے لقب سے دہلی کا بادشاہ ہوا، ان دنوں پائے تخت میں "آخور بک" کا عہدہ رکھتا تھا، اور اسے گزند پہنچ جانے کے اندیشے سے ملک تغلق کچھ دن تک کوئی جنگی کارروائی نہ کر سکا۔ حتیٰ کہ ملک جونا ایک شام کو چھپ کر دہلی سے نکل گیا اور صحیح سلامت سرستی آ پہنچا جہاں اس کے باپ کی طرف سے اسی زمانے میں ایک فوجی دستہ قلعے پر قابض ہو گیا تھا۔ اب لشکر تغلق نے دیپالپور سے حرکت کی اور خسرو کے رفیقوں کو دو مقام پر شکست دیتا ہوا دہلی پہنچ گیا۔ خسرو اور اس کے ساتھ دینے والوں میں سے بمشکل کوئی شخص زندہ بچا ہوگا کیونکہ جو لڑائی میں قتل ہونے سے بچ کر بھاگے وہ کہیں بھی نہ چھپ سکے۔ سارا ملک، بلکہ کہنا چاہیئے کہ زمین و آسمان، ان کا دشمن ہو گیا تھا اور کئی دن تک وہ جا بجا سے پکڑے ہوئے آتے اور قتل کرا دیے جاتے تھے۔

یہ بے رحم غاصب اپنے کئے کی سزا پا چکے تو فاتح سردار اپنی خیمہ گاہ سے شہر میں آیا اور "قصر ہزار ستون" میں مجلس عزا منعقد کی جس میں خاندان علائی کی تباہی پر "جمیع بزرگان ملک" نے جمع ہو کر عبرت کے آنسو بہائے۔ غازی ملک تغلق کی فتح اور ظالموں سے انتقام لینے پر خدا کا شکر ادا کیا گیا۔ پھر اسی مجمع میں سردار موصوف نے بہ آواز بلند اعلان کیا کہ میں خاندان علائی کا ایک ادنیٰ نمک خوار ہوں اور میں نے محض اپنے ولی نعمت کا انتقام لینے کے واسطے تلوار کھینچی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ اس میں کامیابی ہوئی اور غدار غاصب اپنے کیفر کردار کو پہنچے۔ اب تمام بزرگان ملک یہاں جمع ہیں۔ چاہیئے کہ خاندان علائی کا اگر کوئی فرد بھی زندہ موجود ہے تو اسے ڈھونڈ کر لائیں اور تخت پر بٹھائیں کہ بغیر کسی تخت نشین بادشاہ کے سلطنت کے کاروبار میں خرابی کا اندیشہ ہے۔ لیکن اگر بدنصیبی سے اس شاہی خاندان کا کوئی وارث باقی نہیں رہا تو پھر کسی اور ایسے شخص کا جو آپ کے نزدیک اس منصب کا اہل ہو، انتخاب کر لینا چاہیئے۔ اور آپ جسے منتخب کریں گے میں بھی اس کی اطاعت قبول کروں گا۔ کیونکہ اس نے یقین دلایا کہ میں نے بادشاہی کی طمع کے لیے نہیں بلکہ اپنے مربیوں کا بدلہ لینے کے لیے تلوار کھینچی تھی۔ اب آپ لوگ جسے بادشاہ منتخب کریں گے

باب ۳

میں بھی اس کا ساتھ دوں گا۔[1]

عمائد سلطنت نے اس کے جواب میں خود اس کی جنگی فتوحات، ملکی خدمات اور انتظامی قابلیت کی نظیریں پیش کیں اور متفق اللسان اقرار کیا کہ بادشاہی کے منصب جلیل کا تم سے زیادہ مستحق کوئی نہیں ہو سکتا۔ پھر ہاتھ پکڑ کے اسے تخت شاہی پر بٹھا دیا اور دوسرے دن باضابطہ اس کی تاج پوشی کی رسم ادا ہوئی۔ (شعبان ۷۲۰ھ مطابق ۱۳۲۰ء)

"لفظ تغلق" کی تحقیق۔

ضیاء الدین برنی لکھتا ہے کہ چونکہ غازی ملک تغلق نے خسرو خاں کے مقابلے میں دین اسلام اور مسلمانوں کی فریاد رسی کی تھی، لہٰذا اس کا لقب **غیاث الدین** مشہور ہو گیا لیکن خود اس نام "تغلق" کے متعلق فرشتہ نے ملحقات طبقات ناصری کا یہ قول نقل کیا ہے کہ دراصل یہ ترکی زبان کا عام نام "تغلغ" ہے جسے اہل ہند نے الٹ کر "تغلق" بنا لیا۔[2] مشکل الفاظ کو اس طرح الٹ لینا ہندی دماغ اور لب و لہجہ کی عجیب خصوصیت ہے جس کی دیہات کے لوگوں میں آج بھی متعدد مثالیں سننے میں آئیں گی لیکن یہ بات کسی قدر قابل تعجب ہے کہ علمی دنیا نے بھی اس تصرف کو قبول کر لیا حالانکہ اسی لفظ تغلغ کی ایک اور بہتر صورت "قتلو" بھی موجود و مروج تھی۔ زیادہ تعجب یہ ہے کہ ابن بطوطہ بھی اسے تغلق لکھتا ہے اور اسی کی مستند روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ترکی قبیلہ "کرونا" کا ایک غریب آدمی تھا اور کسی سوداگر کے ساتھ سندھ آ کر، علاء الدین کے بھائی الغ خاں کی سرکار میں نوکر ہوا۔ پھر ادنیٰ پیادے سے بڑھتے بڑھتے، سوار، سردار، صوبہ دار اور آخر میں سلطنت دہلی کا فرماں روا ہو گیا۔ ضیاء الدین برنی کا اس کے حسب و نسب کے متعلق سکوت بھی غالباً اس امر کا بالواسطہ ثبوت ہے کہ وہ ابتدا میں گمنام اور بہت کم رتبہ "گلوانی" یعنی بارگیر تھا۔[3]

---

[1] برنی صفحہ ۴۲۲۔ نیز دیکھو مثنوی تغلق نامہ۔ آخری ابواب۔

[2] فرشتہ صفحہ ۱۳۰۔

[3] فرشتہ کی روایت کہ غازی ملک تغلق بلبن کے ایک ترک غلام کا، جس نے اسی ملک میں شادی کی، بیٹا تھا

باب ۳

عمدہ اوصاف اور ملکی اصلاحات

سلطان غیاث الدین تغلق کے عمدہ اخلاق اور ذاتی اوصاف کی تعریف میں ہمعصر مورخ نے ورق کے ورق تحریر کیئے ہیں[1] لیکن اس تاریخ میں اصولاً ہم کو بادشاہ یا امرا کے صرف ان ذاتی حالات سے بحث رکھنی چاہیئے جن کا ملکی معاملات یا انتظامات سے کوئی تعلق ہو۔ لہٰذا اس جگہ یہ کہنا کافی ہوگا کہ یہ پختہ کار سپہ سالار نہایت منتظم، اعتدال پسند اور فرض شناس فرماں روا تھا جس کے چند سالہ عہد حکومت میں بہت سی انتظامی خرابیاں دور ہوئیں۔ سپاہی اور عہدہ داروں کو ٹھیک وقت پر بلا نقصان ”یک دانگ و درم“ نقد تنخواہیں ملنے لگیں۔ حکومت کی باخبری اور انصاف پسندی نے ہر شخص کو یقین دلا دیا کہ جس طرح ہر جرم و غفلت کی مناسب سزا ملے بغیر نہ رہے گی اسی طرح حسن خدمت بھی اس دور میں بغیر صلہ رائگاں نہ جائیگی رعایا میں عام طور پر فراغت و خوش حالی کے آثار پیدا ہوئے۔ بہت سے ویران علاقے آباد اور بنجر زمینیں مزروعہ ہوگئیں اور اگر برنی کا قول محض شاعرانہ مبالغہ نہیں ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ آب پاشی کے واسطے نہریں کھدوانے کا طریقہ سب سے پہلے اسی بیدار مغز و رعایا پرور سلطان کے عہد میں جاری ہوا۔ کم سے کم اس بیان کی صداقت میں تو کسی شبہے کی گنجائش نہیں کہ علاء الدین کی زیادہ طلبی کی بجائے سرکاری مالگزاری، پیداوار کے دسویں یا گیارھویں حصے کے حساب سے مقرر کی گئی اور تاکیدی احکام نافذ ہوئے کہ صاحبان اقطاعات کی سب سے مقدم کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ شرح مالگزاری کی جگہ زراعت کو ترقی دیں تاکہ سرکار کا مالی فایدہ بھی دیرپا ہو[2]

الحاق ورنگل

ممالک دکن اور بنگالے کی لڑائیاں اور آخر میں سلطنت دہلی سے قطع تعلق،

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ (فرشتہ صفحہ ۱۳۰) ابن بطوطہ کے قول کے مقابلے میں کچھ وقیع نہیں کیونکہ اس آفریقی سیاح نے مذکورۂ بالا روایت شیخ رکن الدین ملتانیؒ سے سنی تھی جو خاص اس زمانے کے نہایت مشہور محترم و روشن دل تھے، دیکھو سفرنامہ ابن بطوطہ حالات سلطان غیاث الدین تغلق، نیز الیٹ کی تاریخ جلد سوم صفحہ ۶۰۶)

[1] برنی از صفحہ ۴۲۵ تا ۴۴۶۔

[2] برنی صفحہ ۴۲۹۔ نیز دیکھو سرہنری الیٹ کا ترجمہ اور حاشیہ، جلد سوم صفحہ ۲۳۰ و ۲۳۱۔

باب

آئندہ چالیس برس کے سب سے اہم سیاسی واقعات ہیں نہ ان میں سے شمالی دکن کے مستقل طور پر سلطنت دہلی سے ملحق ہونے کا حال ہم پہلے پڑھ چکے ہیں۔ اب تلنگانے یعنی ریاست ورنگل کی باری تھی اور اندرونی انتظامات کے درست ہوتے ہی حکومت دہلی کی جانب سے ۷۲۱ھ ۱۳۲۱ء میں شہزادۂ جونا کو فوج کثیر دے کر ادھر بھیجا گیا۔ شہر ورنگل کا حملہ آوروں نے محاصرہ کر لیا تھا لیکن مفسدوں نے جھوٹی خبریں اڑا کے لشکر میں پھوٹ ڈلوادی اور یہ فوج بہت ابتر حال میں ناکام واپس آئی مگر سال آئندہ شہزادۂ جونا دوسری فوج لے کر تلنگانے میں داخل ہوا اور بیدر و ورنگل کے قلعے تسخیر ہو گئے۔ راجہ (لدّر دیو) اور اس کے بہت سے سردار اور عزیز اقربا گرفتار کر کے مال غنیمت کے ساتھ دہلی بھیجے گئے۔ فتحمند شہزادے نے جا بجا اپنے حکام اور عہدے داروں کا تقرر کیا اور ملک کی از سر نو تنظیم کے ضمن میں ورنگل کا نام تک بدل کر سلطان پور کر دیا جو گویا اس امر کی تصدیق و توثیق تھی کہ ملک تلنگانہ اب مستقل طور پر دہلی کی اسلامی سلطنت کا ٹکڑا ہے۔ (۷۲۳ھ ۱۳۲۳ء)

معاملات بنگالہ۔ اسی زمانے میں اطلاع ملی کہ بنگالے میں اندرونی فساد اور خانہ جنگی نے رعایا کے امن و امان میں خلل ڈال دیا ہے اور حکومت کا اصلی حقدار اپنے باغی بھائی بہادر شاہ کے ہاتھ سے عاجز آ گیا ہے لہٰذا اس شورش کو دفع کرنے کے واسطے خود سلطان غیاث الدین کو اس طرف جانا اور شہزادۂ ولی عہد جونا کو ورنگل سے بلا کر دہلی میں اپنا نائب بنانا پڑا کہ شمالی سرحدوں پر بھی نگاہ رکھے جہاں دوبارہ مغل ترکتازوں کی جانب سے کسی قدر اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ یہاں یہ صراحت کر دینی چاہیئے کہ ناصر الدین بن بلبن کے زمانے سے ممالک بنگال کی صوبہ داری موروثی ہو گئی تھی، اور یہاں کے حکمراں اندرونی طور پر قریب قریب خود مختار تھے

لہ۔ اب وہ الغ خاں کے خطاب سے یاد کیا جاتا تھا جسے اس زمانے کے انگریز مورخوں نے غلطی سے الف اور الپ خاں بنا دیا ہے۔

لہ۔ ان واقعات کو ٹھیک سمجھنے کے لیے ابن بطوطہ کے سفرنامے اور ضیاء الدین برنی کی تاریخ کو پہلو بہ پہلو رکھ کر پڑھنے کی ضرورت ہے جو ایک دوسرے کی کمی کو پورا کرتے رہیں۔

باب

جو سلطنت دہلی کی سیادت کو تسلیم کرتے اور کبھی کبھی بطور خراج تحائف و ہدایا بھی دربار دہلی کو بھیجتے رہتے تھے مگر ان کی اندرونی آزادی کو بعض خاص وجوہ سے تقویت پہنچتی تھی، یعنی اول تو بنگالے کی پائے تخت سے دوری کہ خاص اہتمام کے بغیر حکومت دہلی کا لکھنوتی کے اندرونی حالات سے واقفیت رکھنا یا مداخلت کرنا محال تھا۔ دوسرے ابتدائی فتوحات کے وقت سے بنگالے میں مسلمان سپاہی اور سرداروں کی ایک بڑی جماعت آکر بس گئی تھی اور ان کی اولاد نیز نومسلموں کی کثرت سے یہاں مسلمانوں کا بڑا جتھا بن گیا تھا جو بنگالے کو اپنا وطن سمجھتے تھے اور اپنے اندرونی معاملات میں مداخلت ناپسند کرتے تھے پس حکومت دہلی بھی اسلامی بنگال کے مقابلے میں سخت گیری کرنے سے ایک حد تک احتراز کرتی تھی، اس موقع پر بھی فوج کشی کی غرض حکومت بنگالہ کے جائز ورثا کو بے دخل کرنا نہ تھی بلکہ محض بغاوت کا استیصال اور اصلی حقدار شہاب الدین کو مدد پہنچانی منظور تھی جس کے لیے سلطان تغلق نے مشرقی بنگالے تک سفر کیا اور باغی بہادر شاہ کو گرفتار کر کے اپنے ہمراہ دہلی لے آیا۔ شہاب الدین جو ماتحت خراج گزار کی حیثیت سے سلطان کے ہمرکاب تھا۔ حکومت بنگال پر بحال کر دیا گیا۔ سنہ ۷۲۴ھ / ۱۳۲۴ء[1]

بنگالے کی آزادی۔

دہلی کی صدر حکومت سے بنگالے کا یہ ماتحتانہ تعلق ایک لحاظ سے سنہ ۷۶۱ھ / ۱۳۵۹ء تک قائم رہا جبکہ سلطان فیروز شاہ تغلق نے دوسری مرتبہ بنگالے پر فوج کشی کی اور سکندر شاہ بنگال کو صلح کرنے پر مجبور کیا۔ لیکن اس صلح کے حالات اور بعض شرائط سے ثابت ہوتا ہے کہ سلطان دہلی غالباً پہلے سے اپنے حریف کو بنگالے کا بادشاہ مانتا تھا اور اس اعتبار سے فرشتہ کا یہ قول صحیح سمجھنا چاہیئے کہ دراصل حکومت بنگال سنہ ۷۵۵ھ / ۱۳۵۴ء سے آزاد و خود مختار تسلیم کر لی گئی تھی[2] اور اس کے بعد وہ تقریباً پونے دو صدی تک

---

[1] برنی صفحہ ۴۴۹۔

[2] فرشتہ صفحہ ۱۴۲۶۔ الفنسٹن اور ونسنٹ اسمتھ کا یہ لکھنا کہ محمد تغلق کے زمانے سے بنگالہ آزاد ہوگیا تھا درست نہ ہوگا کیونکہ تاریخ فیروز شاہی نیز تاریخ مبارک شاہی (ترجمہ الیٹ) کی متواتر روایتوں سے ثابت ہے کہ فیروز شاہ تغلق کی ابتدائی حکومت میں بنگالہ کچھ عرصے تک سلطنت دہلی کا حصہ رہا۔

ایک مستقل اور جداگانہ سلطنت رہی جہاں شیر شاہ سوری سے قبل یکے بعد دیگرے اٹھارہ یا انیس مسلمان بادشاہ تخت نشین ہوئے جن کے حالات قلمبند کرنا ہماری تاریخ کے احاطے سے خارج ہے۔

سلطنت دکن

ممالک دکن کا حال بنگالے سے بہت مختلف تھا۔ جس زمانے کا ہم ذکر کررہے ہیں اس وقت یہ ملک مسلمانوں کے لیے قریب قریب بالکل نئے اور غیر ملک تھے اور خاندان تغلق برسر حکومت ہوا ہے تو ان کی فتح کو بمشکل بیس برس گزرے تھے۔ نقشے میں دیکھیے تو دہلی سے لکھنوتی اور ورنگل کا فاصلہ تقریباً مساوی نظر آتا ہے لیکن شمالی ہند کے آباد و سرسبز میدانی قطعات اور گنگا میں دریائی سفر کی آسانیوں نے بنگال و دکن کی طے مسافت میں بہت بڑا فرق پیدا کردیا تھا اور دہلی سے جنوب کی طرف چند منزل کے بعد ہی غیر آباد جنگل اور دشوار گزار پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا تھا اور سفر کی یہ مشکلات مالوے کے خطے سے آگے بڑھتے ہی زیادہ ہوجاتی تھیں۔ یہی سبب ہے کہ نہ صرف دکن کی فتح میں بہت دیر لگی بلکہ بعد میں بھی شمالی ہند کے مسلمان مدت دراز تک ادھر آنے سے گھبراتے رہے اور درحقیقت عہد عالمگیر سے قبل دکن "ہندوستان خاص" سے بالکل جداگانہ ملک سمجھا جاتا رہا۔ خلاصہ یہ کہ سلطان محمد تغلق ہندوستان کا پہلا فرماں روا ہے جس نے شمالی ہند کا جنوبی ہند سے پیوند ملانا چاہا اور معلوم ہوتا ہے کہ جب لوگوں نے خوشی سے اس کے اولوالعزمانہ ارادوں میں ساتھ نہ دیا، تو اس نے حکماً دہلی کی آبادی کو دولت آباد (دیوگیری) میں منتقل کردیا کہ دکن میں مسلمانوں کی مستقل سکونت قائم ہوجائے۔

سلطان محمد تغلق

یہ بادشاہ، جس کی فتوحات دکن اور دہلی میں نیابت بادشاہی کا ذکر شہزادہ (فخرالدین) جونا کے نام سے اوپر گزر چکا ہے اپنے باپ کی مہم بنگالہ سے واپسی اور ناگہانی وفات[1] کے بعد سریر آرائے سلطنت ہوا (ربیع الاول ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء) اور اپنی

[1] کئی روایات سے اس بات کا شبہ ہوتا ہے کہ تغلق اول کی ناگہانی موت میں جونا کی سازش کا دخل تھا اور اس کی فاتحانہ مراجعت کے وقت شہر دہلی سے باہر جو چوبی قصر تیار کرایا گیا تھا کہ بادشاہ وہاں ٹھیر کر

باب۳

حیرت انگیز قابلیت سے اس نے بہت جلد اندرونی نظم ونسق میں ایک انقلاب پیدا کردیا۔ مورخ ضیاءالدین برنی اس بادشاہ کا مصاحب خاص تھا اور

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ۔ جلوس کے ساتھ شہر میں داخل ہو) اس میں بقول ابن بطوطہ عمداً یہ "صنعت" رکھی تھی کہ جب اس کے ایک خاص حصے کو ہاتھی مس کریں تو اس کی چھت گر پڑے۔ چنانچہ باریابی کے بعد جب امرا اس قصر کے باہر چلے آئے، تو ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ شہزادۂ جونا نے ہاتھیوں کے پیش کرنے کی اجازت لی اور خود اس قصر (یا "کشک") کے باہر نکل آیا۔ پھر جس وقت ہاتھی پیش ہوئے تو ان کے ایک خاص طرف سے گزرتے ہی قصر کی چھت یکایک گر پڑی اور سلطان اور اس کا منجھلا بیٹا محمود اس کے نیچے دب کے مرگئے۔ ابن بطوطہ یہ بھی لکھتا ہے کہ جونا کے اشارے سے گری ہوئی چھت کے نیچے سے سلطان کو نکالنے میں تساہل اور تاخیر کی گئی... (سفرنامہ، حالات "غیاث الدین تغلق شاہ") مورخ برنی کا بیان ہے کہ جس وقت سلطان اس قصر میں ٹھیرا اور امرا کی باریابی کے بعد دسترخوان بچھایا گیا تو یکایک چھت پر بجلی گری اور سلطان اور شہزادہ محمود دب کے مرگئے اور باقی امرا جو ہاتھ دھونے کے واسطے اس وقت باہر نکل آئے تھے، بچ گئے (صفحہ ۴۵۲) اسی ضمن میں فرشتہ کا قول بھی نقل کرنے کے لائق ہے کہ "بعض تواریخ میں لکھا ہے کہ چونکہ یہ قصر بالکل تازہ بنا ہوا تھا لہٰذا جس وقت اس کے قریب سے ہاتھیوں کی دوڑ ہوئی تو ان کے پاؤں کی دھمک سے چھت گر پڑی (اور سلطان اور پانچ اور آدمی جو وہاں موجود تھے اس کے نیچے دب کر مرگئے) اور بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ ایسی عمارت بنانے کا مقصد ہی یہ تھا کہ الغ خاں (شہزادہ جونا) باپ کی جان لینی چاہتا تھا، جسے ضیاءالدین برنی نے فیروز شاہ تغلق کے خوف سے اپنی تاریخ میں ظاہر نہیں کیا۔" اما برضمائر ارباب بصیرت پوشیدہ نخواہد بود کہ این حکایت از عقل بسیار بعید است، چہ کہ الغ خاں با پدر برسر مائدہ حاضر بود، ایں کرامات از کجا داشت کہ بمجرد برآمدن او سقف فرود آید؟ و از ہمہ رنگین تر آنکہ صدر جہاں گجراتی در تاریخ نوشتہ کہ الغ خاں ایں عمارت را بہ طلسم برپا داشت، وحاجی محمد قندھاری در تاریخ خویش نوشتہ کہ دراں ساعت کہ سلطان بدست شستن مشغول بود، صاعقہ از آسمان نازل شد و سقف شگافتہ بر سرش ریخت و ایں روایت بر تقدیر وقوع بصحت اقرب می نماید، واللہ اعلم" (صفحہ ۱۳۴) لیکن راقم الحروف کا قیاس یہی ہے کہ درحقیقت چھت ہاتھیوں کی دھمک سے اتفاقاً گری اور بعض لوگوں نے بدگمانی سے یقین کرلیا کہ اس میں ضرور شہزادہ جونا کی غداری کو دخل تھا کہ وہ بچ گیا اور باپ اور بھائی دب کے مرگئے) ملا عبدالقادر بدایونی کی رائے بھی فرشتہ سے ملتی جلتی ہے (دیکھو منتخب التواریخ صفحہ ۲۲۴)۔

باب ۳

اس نے بہت تفصیل کے ساتھ اس کے ذاتی اوصاف اور عیوب بیان کئے ہیں۔ وہ گواہی دیتا ہے کہ سلطان محمد تغلق کی خوبیٔ انتظام نے ممالک قریب و بعید کا فرق مٹا دیا تھا اور جس وضاحت سے نواح دہلی کی جمعبندی اور مساحت و مالگزاری کے نقشے، نیز سرکاری آمد و خرچ کا حساب ''دیوان وزارت'' میں موجود رہتا تھا، بالکل اسی طرح بنگالے اور دکن کے دیہات کے تمام کاغذات قصر ہزار ستون میں مہیا ہو گئے تھے اور جس طرح کہ حسابات پہنچنے کے بعد مضافات دہلی کے کارکنوں اور متصرفوں کے کام کی جانچ پڑتال ہوتی تھی اور بقایا اور فواضل میں چند پیسے کی چوک محال تھی، بالکل اسی طرح دور دراز کے کارکنوں، متصرفوں اور والیوں سے ایک ایک پیسے کا حساب لے لیا جاتا تھا۔۔۔ اور ہر روز سو دو سو شاہی فرمان تمام اقطاع و بلاد کے حکام کے نام نافذ ہوتے رہتے تھے چنانچہ ایک نیا محکمہ (دیوان) محض شاہی فرامین کی تحریر و نفاذ اور جوابات وصول کرنے کے لیے قائم کر دیا گیا تھا''۔ (صفحات ۳۶۸ و ۳۷۰)

دکن میں اسلامی نوآبادی

ان اصلاحات نے قدرتی طور پر سرکاری مداخل میں نمایاں اضافہ اور شاہی خزانے کو معمور کر دیا۔ سلطان کی داد و دہش دور دور تک مشہور ہو گئی تھی اور مستحقین و مساکین، علما و طلبہ کو اس کی سرکار سے لاکھوں روپیہ تقسیم ہوتا تھا بیرونی ممالک کے جس قدر اشخاص اس کے عہد میں دہلی آئے، کبھی نہ آئے تھے اور جیسا کہ ابن بطوطہ نے تصدیق کی ہے یہ شہر اب جنوب و وسطی ایشیا کا سب سے بڑا مرکز و مرجع بن گیا تھا۔ لیکن برنی کا یہ خیال کہ سلطان کی مالی اصلاحات محض اس داد و دہش کو جاری رکھنے کے لیے تھیں، صحیح نہیں ہے۔ یہ صرف طبعی فیاضی تھی کہ اس کے دربار سے کوئی سائل خالی نہ جاتا تھا، یا یہ کہ ذاتی واقفیت کی بنا پر وہ اہل علم اور فقرا کی، ان کی درخواست کے بغیر، نہایت دریا دلی سے خدمت کرتا تھا۔ لیکن درحقیقت مالی اصلاح نیز اضافہ محاصل[۱] میں جو کوشش

[۱] سلطان محمد تغلق نے شرح مالگزاری کو کئی گنا بڑھانے کے علاوہ، نئے نئے محصول بھی رعایا پر لگا دئے تھے جن میں ''کیٹل ٹیکس'' اور ''ہوس ٹیکس'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس زمانے میں انھیں محض

محمد تغلق نے کی اس کی اصلی غرض کچھ اور تھی۔ وہ نہایت بلند خیال فرماں روا تھا۔ فن سپہ گری کی طرح علم کی اکثر شاخوں میں اس نے مہارت حاصل کی تھی۔ اس کی ذہانت و زیرکی، نیز قوت استدلال و طلاقت لسانی کی بھی بعض دلچسپ شہادتیں محفوظ ہیں غرض مختلف قابلیتوں کے اعتبار سے وہ اپنے معاصرین میں سب سے نمایاں نظر آتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ملکی خوش حالی اور وسعت سلطنت کے جو منصوبے اس نے سوچے تھے ان میں کوئی شخص اس کا شریک صلاح کار نہ تھا اور وہ لوگوں کو بالکل انوکھے اور محض تکلیف دہ معلوم ہوتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ رعایا کی چیخ پکار اور عام مخالفت کے باوجود ان منصوبوں پر بادشاہ کا عمل کرنا اس کی مطلق العنانی اور خود رائی کی دلیل ہے جس نے آخر کار اسے بری طرح ناکام و رسوا کیا۔ بایں ہمہ اس زمانے کے سیاسی آئین کے بموجب محمد تغلق اس بات کو اپنا اخلاقی فرض سمجھتا تھا کہ بادشاہ نے نیک نیتی سے بہبود عام کی جو تدابیر سوچی ہیں، ان پر علی الرغم جمہور عمل کرے۔ انھی منصوبوں میں سے ایک، دکن میں اسلامی نوآبادی بسانے کا منصوبہ تھا اور سلطان کا یہ خیال درحقیقت درست تھا کہ جب تک خاص اہتمام نہ کیا جائے گا، شمالی ہند کے مسلمان یہاں آکر نہ بسیں گے اور اس لیے ان ممالک پر اطمینان سے حکومت کرنا محال ہوگا۔ نظر بریں اس نے شہر دیوگیری کو (دولت آباد کے نئے نام سے) اپنا جنوبی پائے تخت قرار دے کر یہاں سے دہلی تک صاف راستہ بنوایا اور ہر منزل میں کئی کئی سرائیں تعمیر کرائیں جن میں ٹھیرنے اور کھانے پینے کا کافی انتظام تھا۔ عمائد و امرائے دہلی سے منہ مانگی قیمتیں دے کر ان کے دہلی کے مکانات اور جائدادیں خرید لیں اور حکم دیا کہ اب وہ اہل و عیال کے ساتھ دکن جا کر دولت آباد میں آباد ہو جائیں۔ لائق ذکر یہ بات ہے کہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:۔ "گاؤ شماری" و "خانہ شماری" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ ملاحظہ ہو منتخب التواریخ صفحہ ۲۴۷ بحوالۂ تاریخ مبارک شاہی۔ اس جگہ یہ تصریح کر دینی مناسب ہوگی کہ ابن بطوطہ کے سفرنامے اور برنی کی تاریخ کے سوا، اس عہد کے حالات کو فرشتہ نے طبقات اکبری اور منتخب التواریخ میں ایسی کئی قدیم تواریخ کو سامنے رکھ کر جمع کیا ہے، جو اب ناپید ہیں۔ ۱۲

باب ۳

اس تجویز پر سلطان کے ایما سے سب سے پہلے خود اس کی ماں مخدومۂ جہاں نے عمل کیا جن کے ہمراہ متعلقین، ملازمین، علماء اور درویشوں کی پوری جماعت دہلی سے اٹھ کر دولت آباد آگئی! (۷۲۷ھ ۱۳۲۶ء)۔

دکن میں لوگوں کے بسانے کی بظاہر اس سے بہتر کوئی صورت نہ تھی کہ صرف ایک شہر کی آبادی کو دولت آباد میں منتقل کر کے پھر اس شہر (دہلی) کو گرد و جوار کے لوگوں سے دوبارہ معمور کر دیا جائے۔ چنانچہ سلطان محمد تغلق نے یہی کوشش کی تھی لیکن بدنصیبی سے اس واقعے کے کچھ دن بعد ہی سخت خشک سالی ہوئی اور دوآب کے بہت سے کسان جو بادشاہ کی زیادہ طلبی سے پہلے ہی عاجز و مفلس رہ گئے تھے، زراعت چھوڑ کر رہزنی کرنے لگے۔ ادھر دہلی کا تخلیہ اور ہندوستان کی اندرونی ہل چل سن کر منگولوں نے حملہ کیا اور سارے پنجاب کو تاراج و تباہ کر گئے! (۷۲۹ھ ۱۳۲۸ء)

فتح خراسان کا ارادہ۔

سلطان یہ اطلاع ملتے ہی دہلی پہنچ گیا تھا اور اس نے نہ صرف حملہ آوروں کو اپنے ملک سے دفع کیا بلکہ ان کے حملوں کے مستقل سد باب کی وہ تدبیر سوچی جو حقیقت میں دفاع ہند کی بہترین ضمانت ہو سکتی تھی۔ یعنی اس نے ارادہ کیا کہ اپنا پہلا مورچہ کوہستان سلیمان کے پار، اس ملک میں قائم کرے جو منگولوں کے قبضے میں رہ کر ہندوستان کے حملوں میں جنگی مرکز کا کام دیتا تھا! افغانستان کے یہ ہمسایہ علاقے بالعموم خراسان کے مغل صوبہ داروں کے ماتحت رہتے تھے اور بظاہر یہی وجہ ہے کہ ضیاء الدین برنی اس ارادہ کو "فتح خراسان" کا منصوبہ کہتا ہے حالانکہ قرین قیاس یہ ہے کہ شاید سلطان صرف موجودہ افغانستان پر اپنا تسلط جمانا چاہتا تھا اور اس کے لیے جنگی تیاریوں کے ساتھ ساتھ اس نے وہاں کے ذی اثر لوگوں کو لاکھوں روپیہ دیا تھا کہ حملے کے وقت وہ ہندی حملہ آوروں سے مل جائیں!

سکہ مس

ہمعصر مورخ نے ان واقعات کو ذاتی ناراضی کی وجہ سے بہت بڑے پیرائے میں لکھا ہے اور اگر ہم غور و احتیاط کے ساتھ اصلی واقعات اور اس کی رائے میں امتیاز نہ کریں گے تو اکثر فارسی اور انگریزی تاریخ نویسوں کی طرح، راستے سے بھٹک کر، اصلی حالات کو ٹھیک ٹھیک نہ سمجھ سکیں گے۔ ورنہ، شمالی ہند کے سب سے دولتمند شہر کے باشندوں کا دکن چلے جانا، دولت آباد کو اہتمام خاص کے ساتھ بسانے کے

باب

سرکاری مصارف، اضافۂ محاصل خشک سالی اور مغلوں کی لوٹ مار کی وجہ سے رعایا کی محتاجی اور آخر میں بادشاہ کی پردیسیوں کو داد و دہش اور فتح "خراسان" کے لیے بہت سے روپے کا ہندوستان سے باہر نکل جانا، بہ ترتیب ذہن نشین کرنے کے بعد محمد تغلق کے اس منصوبے کا اصلی سبب بلا دقت سمجھ میں آجاتا ہے جس کی ہمارے مورخ نے سب سے زیادہ ہنسی اڑائی ہے۔ حالانکہ خود اسی کے بیان کردہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ شمالی ہند میں سونے چاندی کے سکے کا قحط ہوگیا تھا اور اس نے زراعت اور تجارت ہر قسم کے کاروبار میں رکاوٹ پیدا کردی تھی۔ بیرونی مہمات کے واسطے حکومت کو "زرِ خالص" کی ضرورت تھی اور خزانے میں اتنا سونا چاندی موجود نہ تھا کہ جن کے سکے اندرونی اور بیرونی ضروریات کے واسطے کافی ہوجائیں۔ پس محمد تغلق نے، جو اس بات کو خوب سمجھتا تھا کہ سکے کا منشا محض مبادلۂ اجناس میں سہولت پیدا کرنا ہے، تانبے کا وہ سکہ یا اشرفی جاری کی جس کی قانونی قیمت آج کل کے "کرنسی نوٹ" کی طرح اصل قیمت سے کہیں زیادہ تھی۔ واضح رہے کہ ممالک چین میں ایسے کاغذی سکے کے رواج کا بہت قدیم زمانے سے پتا چلتا ہے۔ تیرھویں صدی عیسوی کے اخیر میں یعنی سلطان محمد تغلق کے عہد سے تیس چالیس برس پہلے بھی وہاں اور نیز ایران میں مغل بادشاہوں نے اسی قسم کے کاغذی سکے جاری کیے تھے جن پر شاہی مہر ہوتی تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ محمد تغلق کو زیادہ دیرپا سکہ چلانا منظور تھا اور اس نے اپنی رعایا کی ایمانداری کے بھروسے پر یہ تانبے کی "اشرفیاں" ضرب کرا کے ان کی قانونی قیمت سونے کی اشرفیوں کے برابر قرار دی تھی اور کچھ عرصے بعد لوگوں کو اختیار دے دیا تھا کہ جب چاہیں اپنی "مہر مس" کی فرضی قیمت کے برابر سونا یا چاندی سرکاری خزانے سے وصول کرلیں[1]۔

---

[1] ہمعصر مورخ نے اس تمام قصے کو بہت اجمالی اور طعن آمیز طریقے سے لکھا ہے (ص ۴۷۵، ۴۷۶) اور بعد کے فارسی مورخ بھی اسی کے اقوال کو نقل کرتے ہیں۔ لیکن جدید تاریخوں میں اس مسئلے پر ایڈورڈ ٹامس نے کافی تفصیل و تحقیق کے ساتھ بحث کی ہے اور سلطان کی جدت پسندی اور نیک نیتی کو بہت سراہا ہے۔ ملاحظہ ہو "کرانکلز آوف دی پٹھان کنگز"، صفحات ۲۳۹ تا ۲۹۲۔

یہ تانبے کی اشرفی ۷۳۰ھ/۱۳۲۹ء سے ۷۳۲ھ/۱۳۳۲ء تک شاہی ٹکسال میں ضرب ہوتی رہی لیکن اس تین سال کے عرصے میں لوگوں نے اسی قسم کی بے شمار جعلی اشرفیاں خود بنا بنا کے چلانی شروع کر دیں کیونکہ اس زمانے کی کلوں کی طرح اس زمانے کے سکے بنانے کے اوزار عام زرگروں کی دسترس سے باہر نہ تھے، اور اتنے وسیع ملک میں تانبے کی معمولی دھات کا جعلی سکہ بنانے سے لوگوں کو باز رکھنا بادشاہ کی قدرت میں نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے میں جعلی سکے کی وہ کثرت ہوئی کہ "مہرمس" کی وہ قانونی قدر و قیمت غائب ہو گئی اور سلطان کو ناچار یہ نیا سکہ منسوخ کرنا پڑا اور جو تانبے کے سکے لوگوں کے پاس موجود تھے، عام اس سے کہ جعلی تھے یا اصلی، اسی قانونی قیمت پر خزانے میں واپس لینے پڑے جو سرکار نے اجرا کے وقت قرار دی تھی۔

"مہم تبت" ۷۳۸ھ/۱۳۳۷ء

معلوم ہوتا ہے اسی ناکامی اور نقصان نے "فتح خراسان" کے منصوبے پر پانی پھیر دیا لیکن آئندہ کئی سال کے واقعات کا تاریخ سے ٹھیک ٹھیک پتا نہیں چلتا کہ ہم "مہرمس" کی مجتہدانہ ترویج کے اقتصادی نتائج کا صحیح اندازہ کر سکیں۔ البتہ چھ برس کے بعد جب ہم سلطان کو فتح چین کی جنگی تیاریاں کرتے دیکھتے ہیں تو قیاس ہوتا ہے کہ خزانۂ عامرہ کو جو کچھ نقصان تانبے کے سکے کی بدولت اٹھانا پڑا ہو، وہ اس عرصے میں پورا کر لیا گیا تھا اور ممالک ہند پر سلطان کا اتنا تسلط قائم تھا کہ اطمینان کے ساتھ ایسے ملک پر فوج کشی کرے جو آج تک ہندوستان کے کسی فرماں روا نے فتح نہیں کیا۔

امرا نے اس ارادے سے بادشاہ کو روکنا چاہا تھا مگر محمد تغلق نے کسی کی نہ سنی اور اس کے حکم سے سپہ سالار خسرو ملک فوج کثیر کے ساتھ نیپال کے راستے غالباً تبت کی سرحد میں داخل ہو گیا۔ لیکن راستے کی دشواری اور پہاڑی لوگوں کی شدید مزاحمت نے ادھر تو اس کا تعلق اپنے ہندوستانی مرکز سے منقطع کر دیا اور ادھر اس غیر آباد ملک میں رسد میسر نہ آئی۔ پھر سردی اور بارش نے ہندوستانی فوج کی ہمت پست کر دی اور وہ کافی نقصان اٹھا کر ناکام واپس چلی آئی۔ سلطان اس پسپائی سے نہایت ناراض ہوا اور جو فوجیں پیچھے تھیں اور بڑھنے والوں کو

باب ۶

مدد نہ پہنچا سکی تھیں، ان کے قریب قریب ہر سپاہی اور سردار کو نمک حرامی کے جرم میں اس نے بہت سخت سزائیں دیں۔

قحط اور بغاوتیں

برنی واقعات کو جس بری شکل میں پیش کرتا ہے، اسے دیکھ کر قیاس ہوتا ہے کہ شاید محمد تغلق کے دماغ میں فتور تھا۔[1] حالانکہ وہ خود سلطان کی ذہانت وفراست کا قائل ہے اور بہت سے قرائن و واقعات سے بھی اس کی ہوش مندی، خوش نظمی اور کارکردگی میں کوئی شبہہ باقی نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ مہم تبت کی ناکامی پر اس نے جو سزائیں دیں ہم انھیں محض بے عقلی اور جوش غضب پر محمول نہیں کریں گے بلکہ یہ بات بالکل قرین قیاس ہے کہ واقعی "فوج ردیف" نے اپنے حملہ آور حصے کو مدد دینے میں سلطانی ہدایات کی پابندی نہیں کی اور ادائے فرض میں غفلت و تساہل سے کام لیا۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کہ سلطان خطا کاروں کو سزا دینے میں جلادی اور بے رحمی سے کام لیتا تھا اور اس کی سخت گیری نے غالباً حکام و رعایا کو اس سے بیزار کر دیا تھا۔ ادھر یہی زمانہ ہے کہ شمالی ہند میں ایک اور قحط ایسا سخت پڑا کہ سات برس تک[2] بارش نہ ہونے کی وجہ سے ضلعے کے ضلعے ویران اور بنجر ہو گئے۔ حوالی دہلی میں غلہ میسر نہ آتا تھا، لہذا بہت سے فاقہ کش کسان رہزنی کرنے لگے اور مغربی دوآب اور جنوبی پنجاب کے علاقوں میں سخت مصیبت و پریشانی پھیل گئی۔ سلطان محمد تغلق نے بڑی مستعدی سے ان مشکلات کا مقابلہ کیا اور کئی سال تک موجودہ فرخ آباد کے ضلع میں مقیم رہ کر اقطاع دہلی میں رسد رسانی اور از سرِ نو وسائل زراعت و آب پاشی مہیا کرنے کا انتظام کرتا رہا۔[3] پنجاب میں بعض شوریدہ سر زمینداروں نے جو فساد مچا رکھا تھا اسے بھی خود جا کر دفع کیا لیکن

---

[1] چنانچہ الفنسٹن صاحب نے یہی رائے قائم کی ہے (صفحہ ۳۹۵) جس کی "اصابت" کی بنسنٹ اسمتھ صاحب بھی تصدیق کرتے ہیں (اوکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۲۳۸) اگرچہ کہیں الفنسٹن نے کسی اسلامی بادشاہ کی تعریف کر دی ہے تو اسے ونسنٹ اسمتھ صاحب نے خاص اہتمام کے ساتھ رد کیا ہے۔

[2] منتخب التواریخ (صفحہ ۲۳۸) بحوالۂ "مبارک شاہی"۔

[3] برنی صفحات ۴۸۴، ۴۸۵، وغیرہ۔

باب ب

ظاہر ہے کہ ان انتظامات نے خزانے پر بہت بڑا بار ڈال دیا ہوگا اور اسی کو پورا کرنے کے لیے بادشاہ نے دوسرے صوبوں کے مالیے میں وہ اضافے کئے جنھیں ادا کرنے سے بعض صوبہ داروں نے پہلوتہی کی اور جب صدر حکومت کی طرف سے سختی ہوئی تو علانیہ منحرف ہوگئے۔

یہ خیال بھی کہ رعایا خستہ حال، سلطانی سپاہ بے دل اور خزانہ خالی ہے، بغاوت پسند صوبہ داروں کے لیے موجب تحریک تھا، اور جب ایک نے سرکشی کی تو دوسروں کا حوصلہ بڑھ گیا چنانچہ آئندہ دس گیارہ سال میں (۷۵۱ھ/۱۳۴۹ء تک) مالوہ کڑہ، بنگال، دکن، ملیبار، اور سندھ میں کئی بغاوتیں ہوئیں لیکن سلطان محمد تغلق کی بلند ہمتی اور جنگی مستعدی کا اس سے بڑھ کر ثبوت کیا ہوگا کہ وہ ہر صوبے میں خود فوج لے کر گیا اور اکثر مقامات پر باغیوں کا قلع قمع کرنے میں کامیابی پائی۔ حتیٰ کہ صرف بنگال اور دکن ایسے صوبے تھے جہاں باغیوں نے دوبارہ کافی قوت فراہم کر لی اور سلطان بعد مسافت نیز دیگر مصروفیتوں کی وجہ سے دوبارہ ان کی سرکوبی کرنے کا موقع نہ پا سکا۔ ورنہ ہندوستان خاص، مالوہ اور گجرات کے باغیوں کا اس نے نام و نشان مٹا دیا اور بعض گجراتی مفرورین کے تعاقب میں سندھ آیا تھا کہ بخار میں مبتلا ہوا اور کچھ روز حالت سفر میں بیمار رہ کر، یہیں، ٹھٹھہ کے قریب، وفات پائی (محرم ۷۵۲ھ/۱۳۵۱ء)۔

تیسری فصل "عہد لامرکزیت"

دہ کی خودمختاری

مالوہ، گجرات، اور دکن میں جو بغاوتیں ہوئیں اس کے اصلی مجرم "امرائے صدہ" تھے۔ یہ نہ صرف فوجی سردار تھے اور قرینہ یہ ہے کہ تقریباً سو سواران کے ماتحت ہوتے تھے تاکہ لڑائی کے وقت یہ حکومت کی مدد کریں، بلکہ مالگزاری وصول کرنے کا کام بھی ان کے سپرد تھا اور ان میں سے ہر شخص سو سو دیہات کی جمعبندی کرتا تھا اور

باب ۳

غالباً اسی وجہ سے یہ "امرائے صدہ" کہلاتے تھے جہاں ضرورت ہوتی تھی وہاں یہ متعین کئے جاتے تھے اوران کی خدمات کے عوض میں انھیں جاگیریں دی جاتی تھیں۔ تاریخ فیروزشاہی کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ طریقہ علاءالدین خلجی کے پہلے سے رائج تھا۔[1] جب خلجیوں کے عہد میں مالوہ، گجرات اور دکن مسخر ہوئے توان اقطاع کی نگرانی اور مالی انتظام کے لیے یہاں بے شمار "امرائے صدہ" مقرر کئے گئے، چنانچہ تغلقوں کے زمانے میں یہاں سب امرائے صدہ بھرے ہوئے تھے۔ یہ بھی ایک قسم کا "نظام جاگیری" تھا۔ ممکن ہے کہ علاءالدین خلجی کو بھی اس سے اتفاق نہ ہو مگر سلطان محمد تغلق کو اپنے عہد حکومت میں ایسا تلخ تجربہ ہوا کہ وہ اس آئین کا سخت دشمن ہوگیا۔ اس میں خود سلطان محمد تغلق کی غلطی بھی شامل تھی۔ ایک طرف ان سے قتلغ خاں کو جو اپنی مہربان حکومت کی بدولت ہندو مسلم دونوں طبقوں میں ہردلعزیز تھا۔ دولت آباد سے معزول کردیا اور اس کی جگہ اس کے بھائی نظام الدین کو مقرر کیا جس کو حکومت کا مطلق تجربہ نہ تھا۔ اس انتظام سے تمام اہل دکن ناراض ہوگئے۔ دوسری خرابی یہ ہوئی کہ مالوے میں جو دکن کے ساتھ شامل تھا "عزیز خمار" نامی ایک نیچ ذات کے شخص کو مقرر کیا گیا جو اپنی دست درازیوں کی وجہ سے بدنام تھا۔ عزیز خمار کو یہ ہدایت ملی تھی کہ وہ "امرائے صدہ" کا خاتمہ کرے۔ عزیز اس کے لیے بالکل تیار تھا۔ دھار میں آتے ہی جو حکومت مالوہ کا مرکز تھا اس نے ۸۹ امرائے صدہ قتل کروا دئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس ظالمانہ فعل سے گجرات اور دکن کے امرا میں ایک دہشت پھیل گئی۔ گجرات کے امرا نے توفوراً بغاوت کردی اور سلطان خود ۱۳۴۵ءمیں گجرات کی بغاوت فرو کرنے کے لیے آگیا۔ یہ بغاوت ایک حد تک فرو ہوگئی لیکن باغیوں اور ان کے متعلقین کے ساتھ جو غیر معمولی سختی روا رکھی گئی وہ بہت دہشت ناک تھی اور اس پرطرہ یہ ہوا کہ بھڑوچ میں بیٹھ کر سلطان محمد تغلق نے دولت آباد سے بھی امرائے صدہ طلب کئے۔ نظام الدین نے دولت آباد اور اس کے آس پاس سے امرا جمع کر کے سلطان کے پاس بھیجنے کا انتظام کیا۔ ملک احمد لاچین

[1] تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۹۵۔

باب ۲

اور ملک علی نگرانی کے لیے ان کے ساتھ کردئے گئے تھے لیکن دو ایک منزل جانے کے بعد ان امرا کو بادشاہ کی طرف سے خوف ہونے لگا کہ مبادا بادشاہ ان کو قتل کردے۔ آپس میں مشورہ کرکے ان لوگوں نے الٹے پیر واپس ہونے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ملک احمد اور ملک علی کو قتل کرکے یہ دولت آباد واپس ہوگئے۔ اور یہاں سب امرائے صدہ نے نظام الدین کو قید کرکے علم بغاوت بلند کردیا۔ چونکہ اس بغاوت کے لیے ایک رہنما کی ضرورت تھی اس لیے اپنے میں سے ایک شخص اسمٰعیل مخ کو ناصر الدین شاہ کے لقب سے اپنا بادشاہ بنا لیا۔ خزانہ فوج میں تقسیم کیا گیا اور مہاراشٹر کے حصے بخرے کرکے اس کی جاگیریں آپس میں بانٹ لیں ۱۳۴۵ء۔

اسی موقع پر جدید انتظامات کے ضمن میں حسن نامی امیر صدہ کو خطاب ظفر خاں کے ساتھ گلبرگہ اور اس کے قریب تین اقطاع کی حکومت سپرد ہوئی اور اس نے یہاں پہنچ کر بہت جلد اتنی قوت بہم پہنچائی کہ سلطان محمد تغلق بغاوت فرو کرنے کے لیے دکن آیا تو اسے ایک فوج خاص حسن کی سرکوبی کے لیے گلبرگہ بھیجنی پڑی جس کا سپہ سالار سلطان کا داماد عماد الملک (سرتیز) تھا۔

محمد تغلق نے دکن کے باغی بادشاہ کو دولت آباد پہنچ کر محصور کرلیا تھا لیکن اسے بہت جلد بغاوت گجرات کی خبر سن کر واپس جانا پڑا اور باغیوں کی سب سے بڑی لڑائی سلطان کی دوسری فوج کے ساتھ بیدر کے قریب ہوئی جس میں حسن کو دولت آباد اور نیز جنوبی ہند کے راجہ سے معقول مدد مل گئی اور جنگ میں عماد الملک کہ "در شجاعت و مردانگی ضرب المثل روزگار بود" مارا گیا۔ سلطانی افواج نے شکست کھائی اور دکن کے یہ مغربی اقطاع دہلی کے قبضے سے نکل گئے[۱]۔

سلطنت بہمنی

سلطان محمد تغلق کو اس ہزیمت اور داماد کے مارے جانے کی اطلاع گجرات میں ملی تو نہایت آزردہ ہوا اور غالباً پوری طرح یہ بات اب اس کی سمجھ میں آئی کہ دکن میں جبراً مسلمانوں کو بسانا، ایک اسلامی اور قومی خدمت ہو تو ہو،

۱۔ فرشتہ صفحہ ۲۷۶۔

باب ۳

سلطنت دہلی کے حق میں سازگار نہ تھا۔ دکن کی قدیم ریاستوں کی فتح کبھی اس قدر دشوار نہ تھی جس قدر کہ نو آباد مسلمانوں کی بغاوت کو فرو کرنا دشوار تھا۔ نظر بریں اس نے دکن پر دوسری مہم بھیجنی ملتوی کر دی اور قصد کر لیا کہ گجرات و سندھ کے جھگڑوں سے فرصت پاکر بذات خود دکن پر خاص اہتمام کے ساتھ فوج کشی کی جائے[1] ادھر حسن ظفر خاں کی نمایاں فتح نے اس کی ذاتی شہرت و اثر کو چار چاند لگا دئے اور دکن کے نئے بادشاہ نے کمال حق پسندی اور ایثار کے ساتھ اپنے سر سے تاج شاہی اتار کے اس اقبال مند سردار کے سر پر رکھ دیا۔ امرا نے بھی اس تجویز پر صاد کی اور ماہ ربیع الاول ۷۴۸ھ/۱۳۴۷ء میں حسن ظفر خاں نے ”علاء الدین حسن بہمن شاہ“ کے لقب سے دکن کی نئی اسلامی سلطنت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی[2]

سلطان علاء الدین حسن نے اپنے پہلے مستقر گلبرگہ ہی کو حسن آباد یا احسن آباد

۱۔ سلطان نے اس موقع پر جو گفتگو ضیاء الدین برنی سے کی وہ پڑھنے کے لائق ہے، اور اس سے محمد تغلق کے غم و غصہ کا اندازہ ہوتا ہے (برنی صفحہ ۵۲۱ تا ۵۲۲)

۲۔ علاء الدین حسن کے متعلق فرشتہ کی روایت یہ ہے کہ یہ علاء الدین خلجی کے مشہور جنرل ظفر خاں کا بھانجا تھا لیکن تغلقوں کے زمانے میں اس کا خاندان انتہائی فلاکت میں مبتلا ہو گیا۔ چنانچہ سلطان محمد تغلق کے زمانے میں علاء الدین حسن نہایت افلاس کی حالت میں ملتان سے دہلی آیا تھا۔ دہلی کے ایک ہندو زمیندار گنگو نامی نے اس پر ترس کھایا اور اپنے ہاں نوکر رکھا اور اس کی امانت داری سے خوش ہو کر دربار سلطانی میں روشناس کرایا۔ جب یہ امرا میں داخل ہو گیا تو دوسرے امرا سے امتیاز کرنے کے لئے اس کو حسن گنگو بہمنی یا برہمنی کہنے لگے۔ بادشاہ ہونے کے بعد غالباً اس عرف میں تصرف کر کے اس نے اپنے لقب کا آخری حصہ ”بہمن شاہ“ قرار دیا تھا۔ لیکن خوشامدی مصاحبوں نے اتنی گنجائش پاتے ہی اس کا شجرۂ نسب قدیم ایران کے مشہور بادشاہ بہمن بن اسفندیار سے ملا دیا۔ اگر دوسری طرف سے دیکھا جائے تو فرشتہ کی یہ روایت بے سروپا معلوم ہوتی ہے کیونکہ سکے کتبے اور سلاطین بہمنیہ کے جو شجرۂ نسب اور تاریخوں سے دستیاب ہوتے ہیں ان سے فرشتہ کی صاف تردید ہوتی ہے۔ برہان مآثر میں جو شجرۂ نسب موجود ہے۔ زیادہ قابل وثوق ہے اور یہ دکن کی مشہور تاریخ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علاء الدین حسن حقیقت میں بہمن بن اسفندیار کی اولاد میں سے تھا اور لفظ گنگو اصل میں کیکو ہے جو کیکاؤس کی بگڑی ہوئی شکل ہے اور یہ بہمن شاہ کا باپ تھا۔

باب ۳

کے نام سے دکن کی سلطنت کا پائے تخت بنایا تھا اور پہلے یہاں اور پھر نئے پائے تخت (احمد آباد) بیدر میں اس خاندان کے بادشاہ تقریباً پونے دو صدی تک فرماں روائی کرتے رہے اور گو حکومت کا خاتمہ چند سال پہلے ہو چکا تھا لیکن ۹۳۴ھ/۱۵۲۷ء میں اس خاندان کا نام و نشان مٹ گیا۔

علاء الدین بہمن شاہ کی تخت نشینی سے دکن کی مشہور سلطنت بہمنی کی بنیاد پڑتی ہے جس سے دکن کو بڑا فروغ ہوا۔ اسی سنہ سے ہم دکن کا وسطی زمانہ شروع کرتے ہیں کیونکہ یہاں سے قدیم دکن کے تمام اجزا ختم ہو جاتے ہیں اور تمام دکن جدید حکمرانوں کے ہاتھ میں آ گیا جو شمال سے آکر یہاں آباد ہوئے تھے۔ علاء الدین بہمن شاہ نے صرف ۱۱ سال حکومت کی لیکن اس قلیل مدت میں اس نے اپنی نوخیز سلطنت کو مختلف طریقوں سے مستحکم کر دیا۔ پہلے تلوار کے زور سے اس نے سلطنت کے حدود معین کئے اور ان کی حفاظت کی۔ خود سلطنت کے اندر بعض طاقتیں ایسی تھیں جو بغیر تلوار کے زیر نہیں ہوتی تھیں۔ کوکن پر حملہ کر کے مغرب میں گوا تک اور مشرق میں بھونگیر تک اپنے حدود سلطنت وسیع کر لئے تھے اس طریقے سے سلطنت بہمنی کے حدود شمال میں سلطنت خاندیس اور مالوہ کی حد تک تھے اور جنوب میں تنگبھدرا اس کی حد تھی اور لشکر کشیوں سے فارغ ہونے کے بعد علاء الدین نے نظم و نسق کی طرف توجہ کی تھی۔ پہلے نئے پائے تخت گلبرگہ کو آراستہ کرنے کی کوشش کی جو دولت آباد کو چھوڑ کر اسی میں سلطنت کا پائے تخت بنایا گیا تھا اور اس کی غالباً وجہ یہ تھی کہ اول تو یہ سلطنت بہمنی کے تقریباً بیچ میں پڑتا تھا اور قرون وسطیٰ میں پائے تخت کو بیچ میں ہونا چاہیئے دوسرے جنوبی سلطنت وجیانگر سے باخبر رہنے کے لیے یہی موزوں جگہ تھی کیونکہ دریائے تنگبھدرا کے نیچے اس زمانے میں ایک بہت بڑی ہندو سلطنت وجیانگر قائم ہو چکی تھی۔ گلبرگہ اس سے بہت قریب تھا۔ گلبرگے میں عمارتیں اور محلات بنائے گئے۔ اس کے علاوہ سلطنت کے باقاعدہ نظم و نسق کے لیے اس کو چار صوبوں پر تقسیم کیا گیا جو بہمنی اصطلاح میں طرف کہلاتے تھے اور ان پر چار طرفدار مقرر کئے گئے سلطنت کے اس انتظام میں سیف الدین غوری نے بہت حصہ لیا تھا جو امیر الامرا اور

باب

سلطنت کا وزیر اعظم بنایا گیا تھا۔

۱۳۵۸ء میں علاء الدین حسن کا انتقال ہوا اور اس کا بیٹا محمد شاہ اس کا جانشین ہوا۔ یہ اس خاندان کا دوسرا بڑا حکمراں ہے۔ توسیع اور استحکام سلطنت کے سلسلے میں جو کام باقی رہ گیا تھا اور علاء الدین حسن کو موقع نہیں ملا تھا اس کو اچھی طرح پورا کیا۔ راجگان ورنگل اور وجیانگر کے ساتھ اس کی لڑائیاں بہت مشہور ہیں۔ وجیانگر کے ساتھ تو اس وجہ سے لڑائیاں ہوتی رہیں کہ دونوں سلطنتوں کی سرحدیں ملتی تھیں اور رائچور دوآبہ دونوں کے درمیان نزاعی علاقہ تھا۔ محمد شاہ نے اسی علاقے کے حصول کے لئے حملہ کیا تھا اور راجہ وجیانگر بک اول کو سخت شکست دی تھی محمد شاہ کا دوسرا بڑا کام نظم ونسق کو ترقی دینا تھا۔ ابھی مرکزی حکومت کی تشکیل نہیں ہوئی تھی۔ محمد شاہ نے امور مملکت کے انصرام کے لیے ۸ وزرا مقرر کئے اور نہایت سلیقے سے ان کے فرائض کی تقسیم کی گئی۔ دربار کو آراستہ کیا گیا اور اس کی شان وشوکت اس طرح بڑھائی گئی کہ اس میں نہایت قیمتی فرش کیا گیا۔ زرین شامیانے تانے گئے اور بادشاہ کے لیے پرتکلف تخت بچھایا گیا۔ اہل دربار کے کھڑے ہونے کے لیے حسب مراتب جگہ بنائی گئی۔ اور باقاعدہ سپاہی پہرہ دیتے تھے۔ اس طریقے سے حکومت کا اس قدر رعب داب قائم ہوا کہ اہل دکن اچنبا کرتے تھے۔ چنانچہ ان دو عہدوں میں بہمنی سلطنت اندر اور باہر سے اس قدر مستحکم ہو گئی جس قدر اس کو ضرورت تھی۔ لیکن محمد شاہ کے انتقال کے بعد بہمنی سلطنت کی ترقی بہت دنوں تک رکی رہی کیونکہ اس کے جانشینوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ ۱۳۷۷ء میں محمد شاہ کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا مجاہد شاہ تخت نشین ہوا۔ یہ اگرچہ اپنی وجاہت اور قوت جسمانی کی وجہ سے بہت مشہور ہے اور وجیانگر پر اس نے جو یلغار کیا تھا اس سے اس کا غیر معمولی سپاہیانہ دم خم ظاہر ہوتا تھا لیکن اس کو تین سال سے زیادہ حکومت کرنے کا موقع نہیں ملا کیونکہ اس کے چچا داؤد شاہ نے اس کو سازش کرکے مار ڈالا اور خود تخت پر قبضہ کر لیا مگر داؤد بھی زیادہ عرصے تک بادشاہی کرنے نہیں پایا۔ مجاہد شاہ کے ہمدردوں نے ایک سال کے اندر اس کا خاتمہ کر دیا اور محمد شاہ دوم کو جو علاء الدین حسن کا ایک پوتا تھا تخت نشیں کر دیا

۱۳۷۵ء۔ قحط کی اور ایک مصیبت کو نظر انداز کر دیا جائے تو محمد شاہ ثانی کا عہد حکومت ہر طرح سے خوشگوار ثابت ہوا تھا۔ اس میں پورا امن و امان تھا اور لوگ خوشحال تھے۔ نیز علمی چہل پہل سے پائے تخت کو بڑی رونق تھی۔ خود بادشاہ کو علم کا بڑا چسکا تھا اور اسکی وجہ سے میر فضل اللہ انجو جیسے علما ملک میں جمع تھے اور خواجہ حافظ شیراز کو بھی دعوت دی گئی تھی لیکن اس کے انتقال کے بعد جو ۱۳۹۷ء میں ہوا اس کے دو بیٹے غیاث الدین اور شمس الدین یکے بعد دیگرے تخت نشیں ہوئے تو پھر خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ کیونکہ اس وقت تغلچیں نامی ایک ترک غلام سلطنت کے سیاہ و سفید پر حاوی ہو گیا تھا۔ اسی نے غیاث الدین کو ایک مہینے کے اندر قتل کر دیا اور اس کے چھوٹے بھائی شمس الدین کو تخت نشیں کر دیا جو بالکل تغلچیں کے ہاتھ میں تھا۔ اس طرح تمام بہمنی سلطنت تغلچیں کے ہاتھ میں آگئی۔ لیکن اس سلطنت کے ہمدرد اس کو کب گوارا کر سکتے تھے۔ فیروز خاں اور احمد خاں دو بھائی جو احمد خاں کے بیٹے اور علاء الدین حسن کے پوتے تھے اس وقت موجود تھے۔ انھوں نے تغلچیں کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی۔ پہلے تو باہر سے حملہ کیا لیکن یہ ناکام ہوا لیکن اس کے بعد خود گلبرگے میں سازش کر کے تغلچیں کا خاتمہ کر دیا اور شمس الدین کو قید کر کے فیروز خاں تاج الدین فیروز شاہ کے لقب سے ۱۳۹۷ء میں تخت نشین ہو گیا۔

فیروز شاہ کے عہد حکومت کو مختلف حیثیتوں سے سلطنت بہمنی کا معراج سمجھنا چاہیئے۔ اس عہد میں سلطنت بہمنی کو جو دفاعی۔ انتظامی۔ علمی و تمدنی ترقیاں حاصل ہوئی ہیں وہ پھر کبھی نصیب نہیں ہوئیں۔ بات یہ ہے کہ فیروز شاہ اپنے زمانے کا بہت بڑا بادشاہ ہے جس کی سیاسی اور علمی قابلیتیں جواب نہیں رکھتی تھیں۔ سیاسی قابلیت سے اس نے ملک کا دفاعی انتظام کیا۔ وجیانگر پر ایسے یلغار کیے کہ ہری ہر ثانی کے چھکے چھوٹ گئے تھے۔ نیز شمال میں جو خاندیش۔ مالوہ اور گجرات کی سلطنتیں تھیں ان کو بھی بہت کچھ مرعوب کر رکھا تھا۔ ملک کے نظم و نسق کے لیے لائق ارباب سیاست مقرر کیے۔ اپنے بھائی احمد خاں کو خانخاناں اور امیر الامرا بنایا۔ اور میر فضل اللہ انجو کو گلبرگے کا صوبہ دار اور نائب حکومت مقرر کیا۔ انتہائی رواداری کے ساتھ اس نے ہندو عورتوں سے شادیاں بھی کیں اور

باب۳

ہندوؤں کو حکومت میں شریک بھی کیا تھا۔ اس کے علمی مشاغل بھی اتنے بلند تھے کہ شاید ہندوستان کی تاریخ میں سلطان محمد تغلق کے بعد صرف فیروز شاہ کا ہی نام آتا ہے۔ لیکن فیروز شاہ کا آخری زمانہ اچھا نہیں گزرا۔ کچھ تو عیش و عشرت کی طرف زیادہ مائل ہو گیا دوسرے جانشینی کے مسئلے میں بڑی الجھن پیدا ہو گئی۔ فیروز شاہ اپنے بیٹے حسن خاں کو اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا اور اسکے مقابلے میں اس کا بھائی احمد خاں خانخاناں تخت کا دعوے دار تھا کیونکہ وہ زیادہ لائق تھا اور اسی کی تائید سے تغلقیں کے مقابلے میں فیروز کو تخت حاصل ہوا تھا۔ نیز احمد خاں کو گلبرگے کے مشہور بزرگ حضرت بندہ نوازؒ کی تائید بھی تھی جو فیروز شاہ کے زمانے میں دہلی سے آکر گلبرگے میں متوطن ہوئے تھے فیروز شاہ اور احمد خاں میں ان بن ہو گئی۔ بالآخر احمد خاں گلبرگے سے بھاگا اور بیدر کے نواح میں فوج جمع کر کے گلبرگے پر حملہ کر دیا اور ۱۴۲۲ء میں فیروز شاہ کو قید کر کے تخت پر قبضہ کر لیا۔

۱۴۲۲ء سے جبکہ احمد خاں جو احمد شاہ ولی بہمنی کے نام سے مشہور ہے تخت نشیں ہوا تو سلطنت بہمنی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے اس دور میں سلطنت کو پھر کوئی ترقی نہیں ہوئی بلکہ احمد شاہ کے بعد زوال کے آثار پیدا ہو گئے۔ اگرچہ احمد شاہ ایک اچھا تعلیم یافتہ آدمی تھا اور اس میں حکمرانی کا اچھا سلیقہ تھا۔ اس نے بیدر کو اپنا پائے تخت بنا کر اس کی ترقی میں جو جد و جہد کی اس سے اس کا ذوق تعمیر اور انتظامی سلیقہ معلوم ہوتا ہے لیکن خرابی یہ تھی کہ حکومت میں باہر والوں کو بھی قدم جمانے کا موقع دیا گیا۔ اگرچہ تمام سلاطین بہمنی بڑے روادار اور مہمان نواز تھے اور جو لوگ باہر سے آتے تھے ان کو خوشی سے لیتے تھے مگر احمد شاہ اور اس کا بیٹا علاءالدین ثانی اس خصوص میں بہت پیش پیش تھے۔ احمد شاہ کے عہد میں خلف حسن بصری نے ترقی کی تو اس کے بیٹے اور پوتے کے عہد میں محمود گاوان نے غیر معمولی فروغ حاصل کر لیا جو بعد کو چل کر اچھے اور برے نتائج کا باعث ہوا۔ یہ دونوں تاجر کی حیثیت میں یہاں آئے تھے اور بادشاہوں کی مہمان نوازی سے فائدہ اٹھا کر تمام سیاست پر حاوی ہو گئے! اس سے اہل دکن ناراض ہوتے تھے اگرچہ وہ لوگ بھی جو اپنے کو اہل دکن کہتے تھے سب باہر سے آکر یہاں آباد ہوئے تھے لیکن

باب ۳

تین چار پشتوں کے بعد یہ دکھنی ہو گئے تھے اور اب جو لوگ باہر سے آتے تھے ان کو اجنبی کہتے تھے۔ اس سے کشمکش کا بازار گرم ہو گیا۔ علاء الدین ثانی کے عہد میں جو احمد شاہ کے انتقال کے بعد ۱۴۳۵ء کے لگ بھگ تخت نشیں ہوا تھا کشمکش سخت ہو گئی اور خونریزی کی نوبت آگئی۔ خلف حسن بصری اور اس کے سیکڑوں ساتھی اس کا شکار ہو گئے کیونکہ بادشاہ اہل دکن کے مقابلے میں باہر والوں پر اپنی عنایات کی بوچھار کرتا تھا۔ علاء الدین ثانی کا انتقال ۱۴۵۸ء میں ہوا اور اس کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں تخت نشیں ہوا جو ظالم کے لقب سے مشہور ہے۔ یہ تین سال سے زیادہ حکومت نہیں کر سکا۔ ۱۴۶۱ء میں جب اس کا انتقال ہوا تو اس کے دو چھوٹے بیٹے تھے جو اس کے جانشیں ہوئے۔ یکے بعد دیگرے تخت نشیں کئے گئے۔ پہلے نظام شاہ تخت نشیں کیا گیا لیکن ۱۴۶۳ء میں یہ اچانک مر گیا۔ اس کی جگہ اس کا بھائی محمد شاہ دوم جو محمد شاہ لشکری کے نام سے مشہور ہے تخت نشین ہوا۔ چونکہ یہ کمسن تھا اس لیے کچھ تو اس کی ماں نرگس بانو کام کرتی تھی اور زیادہ کام خواجہ محمود گاواں کے سپرد تھا۔ یہ ہمایون ظالم کے زمانے سے کام کرتا تھا لیکن محمد شاہ کی کمسنی کے زمانے میں اس نے غیر معمولی ترقی حاصل کر لی اور محمد شاہ کے سن بلوغ کو پہنچنے کے بعد بھی وہ سلطنت پر پوری طرح چھایا رہا۔ اگرچہ اس کی رہنمائی سے سلطنت کو فائدے بھی پہنچے۔ نظم و نسق کی اصلاح ہوئی۔ علمی ترقی ہوئی چنانچہ اس کا بنایا ہوا مدرسہ اب تک اس کی یاد تازہ کرتا ہے۔ کئی فتوحات ہوئیں۔ مغرب میں تمام کوکن فتح ہوا اور مشرق میں شمالی تلنگانہ اڑیسہ کی سرحد تک فتح ہو گیا اور سلطنت اس قدر وسیع ہو گئی کہ چار صوبوں کی جگہ اس کو آٹھ صوبوں میں تقسیم کرنا پڑا۔ لیکن دوسری طرف محمود گاواں کی تنگ نظری نے سلطنت بہمنی کو بہت نقصان پہنچایا۔ یہ بجائے اہل دکن سے کام لینے کے ترکوں اور ایرانیوں سے کام لیتا تھا اور انھی کو ترقی دیتا تھا۔ ان اسباب سے اہل دکن تمام ناراض ہو گئے۔ اس زمانے میں دکھنی فریق کا رہنما ملک حسن نظام الملک بحری تھا اس نے سازش کر کے محمود گاواں کو بادشاہ کے سامنے قتل کروا دیا۔ ۱۴۸۱ء محمود گاواں کے قتل سے اس کے تمام ہمدرد جو اکثر ترک ایرانی تھے سب بادشاہ سے منحرف ہو گئے اور اس کے احکام کی خلاف ورزی کرنے لگے دوسرے اس کے

باب

قتل کے بعد کوئی ایسا لائق آدمی بھی ملک میں نہیں تھا جو سلطنت کی نگہداشت کرتا۔ اس واقعے کے دوسرے سال محمد شاہ لشکری کا انتقال ہوگیا اور اس کا جانشین محمود شاہ اول بارہ سال کا چھوٹا بچہ تھا۔ اس کی کمسنی نے اور کام خراب کیا جو لوگ منحرف ہوئے تھے وہ سب باغی ہوگئے اور سلطنت کو آپس میں بانٹ کر خودمختار سلطنتیں قایم کرلیں۔ خود بیدر میں جو سلطنت کا پائے تخت تھا برید سرنوبت قابض تھے ایسے حاوی ہوئے کہ بادشاہ کو کٹ پتلی بنادیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ محمود شاہ اور اس کے تمام جانشین برائے نام ہو کر رہ گئے۔ ان کے نام صرف شجرے میں پائے جاتے ہیں۔

وجیانگر سلطنت وجیانگر کا اوپر بارہا ذکر آیا ہے یہ ہندو سلطنت دریائے تنگبھدرا کے نیچے تقریباً اسی زمانے میں قائم ہو چکی تھی جبکہ امرائے صدہ سلطنت بہمنی کا علم نصب کر رہے تھے اس سلطنت سے شاہان بہمنی کی بارہا لڑائیاں ہوتی رہیں جن میں کبھی ایک فریق غالب آتا تھا کبھی دوسرا۔ لیکن اس پیہم جنگ وجدال کا مجموعی طور پر جو کچھ نتیجہ نکلا وہ گویا دکن کے مسلمانوں کو سبق دیتا تھا کہ شمالی ہند سے تعلق قطع کرنے کے بعد خود ان کا اتنی بڑی اور قوی فوجیں مرتب کرنا دشوار تھا کہ جو افواج علائی کی طرح جنوبی ہند کے انتہائی حصے تک ملک فتح کرتی چلی جائیں۔ ادھر ان لڑائیوں نے جنوبی ہند کے باشندوں کو اتنا متحد اور جنگ میں مشاق بنادیا کہ پھر وہ عرصۂ دراز تک مسلمانوں سے مغلوب نہ ہوئے۔

اس اتحاد اور جنگی قوت کا مرکز شہر وجیانگر میں تھا، جس کے بعض عالیشان مندر و محلات اور کھنڈر آج بھی اس کی عظمت رفتہ کی یاد تازہ کردیتے ہیں۔ اس شہر یا سلطنت کی کوئی باقاعدہ تاریخ نہیں لکھی گئی لیکن وہاں کے سکے، کتبات اور دکن کی اسلامی تواریخ نیز پردیسی سیاحوں کے سفرناموں سے بہت سی کارآمد باتیں معلوم ہوتی رہیں اور حال میں کوشش جاری ہے کہ ان سب ماخذوں کو ملاکر وجیانگر کی ایک مسلسل تاریخ مرتب کردی جائے تاکہ عالیشان عمارات، دولت و صنعت، عام آسودگی، کثرت آبادی، جنگی قوت اور درباری تزک و احتشام کی مختلف شہادتوں کے ساتھ تاریخ کے طالب علم وہاں کے سیاسی حالات کا بھی ایک خاکہ اپنے ذہن میں قائم کرسکیں۔ اس موضوع پر اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے

وہ بہت ناکافی ہے۔ دوسرے سلطنت مذکور کی تاریخ کا تمام ہندوستان کے سیاسی معاملات پر کوئی نمایاں اثر نہیں پڑا کہ ہند کی عام تاریخ میں اس کے اندرونی حالات پر بحث کی جائے۔ البتہ سلطنت بہمنی اور اس کے زوال کے بعد دکن میں جو آزاد اسلامی سلطنتیں قائم ہوئیں۔ ان کے سلطنت وجیانگر کے ساتھ بہتیرے تعلقات رہے ہیں اور ممکن ہے کہ ایک کا دوسرے پر اثر ہو۔

اناگندی کی چھوٹی راج دھانی سلطنت وجیانگر کی ابتدا تھی جو دریائے تنگبھدرا کے شمالی کنارے واقع ہے اور اس وقت سلطنت آصفیہ کے حدود میں ایک سمستان کی حیثیت رکھتی ہے۔ جن راجگان نے وجیانگر کی بنیاد ڈالی وہ پہلے اناگندی کے رئیس تھے۔ شمالی سلطنت دہلی کی مخالفت میں تنگبھدرا کی جنوبی وادی میں ایک بڑی سلطنت کی بنیاد ڈالی جو پندرھویں اور سولھویں صدی میں بہت بڑی سلطنت ہوگئی یہ تمام جنوب پر چھائی ہوئی تھی۔ اس کا بانی سنگم اول سمجھا جاتا ہے۔ جس نے سلطان محمد تغلق کی کبھی اطاعت نہیں کی بلکہ اناگندی کے مستحکم حدود میں خود مختار رہا لیکن جب دکن کی اور طاقتیں خود مختار ہوگئیں تو سنگم کو بھی موقع مل گیا اور اس نے وجیانگر کی سلطنت قائم کردی۔ اب یہ بتانا مشکل ہے کہ کس مواد اور مسالے سے اس سلطنت کی تعمیر ہوئی تھی لیکن اتنا صحیح ہے کہ اس سلطنت کا قیام دہلی کی دست درازیوں کے خلاف جنوب کی دراوڑی اقوام کا احتجاج تھا۔ ورنگل اور دوارا وتی پور کی بربادی کے بعد جنوب کی یہ قومیں آزادی کے لیے جنبش کرنے لگیں اور سنگم کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوگئیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بغاوت میں کاکتیا اور یادو خاندان کے اجزا شامل تھے سنہ ۱۳۳۹ء میں سنگم کا انتقال ہوا اور اس کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا ہری ہر اول اس کا جانشین ہوا اور جب سنہ ۱۳۵۴ء میں اس کا انتقال ہوا تو اس کا بھائی بک اول اس کا جانشین ہوا۔ یہ معلوم نہیں کہ ان دونوں بھائیوں نے اس کی تعمیر میں کتنا حصہ لیا تھا لیکن سنہ ۱۳۵۸ء میں وہ اتنی طاقتور سلطنت ہوگئی تھی کہ علاء الدین بہمن شاہ کو اس پر حملہ کرتے ہوئے تامل ہوا اور محمد شاہ اول تخت نشین ہوا تو وجیانگر سے لڑائی ٹھن گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ محمد شاہ نے قدیم ہون کا چلن بند کرکے

باب ۳

جدید بہمنی سکے جاری کردئے تھے جس سے آس پاس کی راج دھانیوں پر برا اثر پڑتا تھا۔ ورنگل کا راجہ کنھیا اور وجیا نگر کا راجہ بک دونوں اس سے ناراض ہوگئے اور آمادۂ جنگ ہوگئے۔ لیکن محمد شاہ کے مقابلے میں شکست کھاگئے۔ ۱۳۶۵ء میں محمد شاہ کی زیادتی سے ایک اور لڑائی ہوئی تھی۔ اس میں بھی ہندو سلطنت کو بُری شکست ہوئی اور ہزارہا ہندو مارے گئے۔ مجاہد شاہ کی تخت نشینی کے بعد دوسری کے لیے پھر لڑائی ہوئی اور بہمنی سلطنت کامیاب ہوئی۔

فیروز شاہ کا ہمعصر ہری ہر دوم تھا جو بک کے انتقال کے بعد جانشین ہوا تھا۔ رائچور کے دوآبہ کے لیے ان میں بڑی لڑائیاں ہوتی رہیں۔ ان میں فیروز شاہ اکثر کامیاب رہا۔ ۱۴۰۶ء میں ہری ہر دوم کا انتقال ہوا اور اس کے بعد اس کا بیٹا بک دوم اس کا جانشین ہوا اور اسی سال پرتھال کا مشہور واقعہ ہوا۔ یہ مدگل کے سنار کی حسین بیٹی تھی۔ اس کو بک دوم حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن بالآخر یہ فیروز شاہ کے بیٹے حسن خاں سے بیاہی گئی۔ بک دوم کے جانشین بہت کچھ غیر یقینی ہیں۔ سول کے بیان کے مطابق بک دوم کا انتقال ۱۴۰۶ء میں ہوا اور اس کے مرنے کے بعد اس کا بھائی دیورائے اول تخت نشین ہوا جو ۱۴۱۳ء میں مرا اور اس کے بعد اس کا بیٹا ویرا بجے تخت پر بیٹھا۔ اس سے بھی فیروز شاہ کے عہد میں لڑائیاں ہوئی تھیں جو بہمنی فوجوں کی شکست کا باعث ہوئیں۔ لیکن جب احمد شاہ ولی تخت نشین ہوا تو اس نے انتقام لینے کے لیے ویرا بجے پر سخت حملے کئے اور ۱۴۲۳ء میں بڑی سخت شکست دی بقایا خراج وصول کیا اور راجہ کا بیٹا دیورائے بادشاہ کی مشایعت کے لیے دریائے کرشنا تک آیا تھا۔ فتح اللہ عماد الملک اور ملک حسن بحری اس لڑائی میں گرفتار ہوکر آئے تھے جو مسلمان ہوکر بڑی خدمات پر پہنچے اور سلطنتوں کے بانی ہوئے۔ علاء الدین ثانی کے اوائل عہد میں بھی یہ خراج دیورائے ثانی سے وصول کیا گیا جو اپنے باپ کے بعد گدی نشین ہوا تھا۔ لیکن چند روز کے بعد اس نے فوج میں کثیر مسلمان بھرتی کئے تا کہ بہمنی سلطنت کا کامیاب مقابلہ ہوسکے اور ۱۴۴۳ء میں رائچور کے دوآبے پر حملہ کردیا نہ صرف مدگل پر قبضہ کرلیا بلکہ رائچور اور بنکاپور کا محاصرہ کرلیا۔

باب ۳

اور بیجاپور اور ساگر تک بڑھ کر حملے کئے لیکن بہمنی حملے سے شکست کھا گیا اور خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ دیو رائے ثانی کا انتقال سنہ ۱۴۴۶ء میں ہوا۔ عبدالرزاق کے سفرنامے سے جو شاہ رخ مرزا کی طرف سے سفیر بن کر آیا تھا معلوم ہوتا ہے کہ دیو رائے کے عہد میں سلطنت وجیانگر پورے عروج پر تھی۔ شہر وجیانگر جو ۶۴ مربع میل تھا بہت بارونق شہر ہو گیا تھا۔ بڑی بڑی عمارتیں تعمیر ہوئی تھیں تنگبھدرا سے نہریں کاٹی گئی تھیں۔ مسلمانوں کی بھرتی کی وجہ سے قوت مدافعت میں بھی کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ آگے چل کر یہ اسلامی فوج کوئی ساٹھ ہزار کے قریب پہنچ گئی تھی۔

دیو رائے ثانی کے دو بیٹے بہمنی لڑائیوں میں مارے گئے تھے۔ اس کا چھوٹا بیٹا ملکارجن اس کا جانشین ہوا تھا اگرچہ اس کی کمسنی سے فائدہ اٹھا کر سلطنت اڑیسہ اور بہمنیہ دونوں نے حملے کئے تھے لیکن بے نیل مرام واپس ہو گئے۔ اس نے پناکنڈا میں سکونت اختیار کی تھی جو مشرق میں واقع ہے۔ اسی کے عہد میں چندگری کی راج دھانی نمایاں ہو گئی ۔ سلووا نرسمہا یہاں کا راجہ تھا۔ اس نے ہمسایہ سلطنتوں کی دست درازیوں سے بچنے کے لیے اپنی قوت مدافعت بڑھا لی کیونکہ اڑیسہ کی سلطنت آگے بڑھ کر حملہ کر رہی تھی اور نیلور تک پہنچ گئی تھی۔ نرسمہا کی طاقت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ وہ آگے بڑھ کر اڑیسہ کے جنوبی اقطاع پر حملہ کر سکتا تھا۔ اسی زمانے میں یعنی سنہ ۱۴۶۷ء میں محمد شاہ لشکری بہمنی اور اس کے مشہور وزیر محمد گاواں نے شمالی تلنگانے پر حملے شروع کر دئے تھے جبکہ نرسمہا کی فوجیں گوداوری کے کنارے راج مندری کے پاس اپنا پڑاؤ ڈالے ہوئے تھیں۔ بہمنی فوج تو نرسمہا کے مقابلے میں زیادہ کامیاب نہیں ہوئی اور وہ کانچی تک حملہ کر کے واپس ہو گئی۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ ملکارجن کو اس کے بھائی ویروپکشن نے قتل کر دیا اور خود تخت پر قبضہ کر لیا۔ چونکہ برادرکشی سے تخت حاصل ہوا تھا اس لیے بہت سے لوگ اس کے مخالف ہو گئے اور اسنے اپنا راستہ صاف کرنے کے لیے کئی آدمیوں کو قتل کر دیا۔ اس سے ناراض ہو کر لوگ نرسمہا کا سہارا ڈھونڈنے لگے چنانچہ مشرقی اور جنوبی اضلاع نرسمہا کے ہاتھ میں چلے گئے۔ بالآخر سنہ ۱۴۸۶ء میں نرسمہا کی فوجوں نے اس جابر کو تخت سے اتار کر خود قبضہ کر لیا۔ اور اس طریقے سے وجیانگر کا پہلا خاندان یہاں ختم ہو گیا۔ نرسمہا نے

باب ۳ چھ سال حکومت کی اور ایک دوسرے خاندان کی بنیاد ڈالی۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے دو بیٹے یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔ ایک جلد مر گیا اور دوسرا چھوٹا تھا اس لیے نرسمہا کا جنرل نارسا حکومت کرتا تھا۔ ۱۵۰۵ء میں نارسا کا انتقال ہوا تو اس کے بیٹے ویرا نرسمہا نے لودیا نرسمہا دوم کو گدی سے اتار کر خود قبضہ کر لیا۔ یہ تیسرا خاندان ہے جو وجیا نگر پر قابض ہوا تھا۔ اس کو بہت سی مخالف طاقتوں کا مقابلہ کرنا پڑا اور بڑی حد تک کامیاب ہوا۔ اگرچہ اس کی وصیت تھی کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے بچے کو تخت نشین کیا جائے جو شیر خوار تھا لیکن وفادار وزرا نے ۱۵۰۹ء میں جبکہ نرسمہا کا انتقال ہوا تھا اس کے بھائی کرشنا دیو رائے کو تخت نشین کیا تھا جو بیجا نگر کا بہت بڑا راجہ ثابت ہوا۔

سلطنت دہلی اس جگہ مقدم یہ ہے کہ ہم شمالی ہند کی صدر سلطنت کے اسباب انحطاط کو مختصر طور پر بیان کر دیں اور یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ دہلی کی مرکزی حکومت میں ضعف آنے کے بعد ہندوستان میں جو خود مختار سلطنتیں جا بجا قائم ہو گئی تھیں ان کی نمایاں خصوصیات تاریخی کیا تھیں؟

اس میں شبہ نہیں کہ سلطان محمد تغلق کی وفات اور اس کے بھتیجے فیروز تغلق کی تخت نشینی (سنہ ۷۵۲ھ / ۱۳۵۱ء) کے ساتھ ہی شمالی ہند میں عام سکون ہو گیا تھا۔ خود سلطان مرحوم باغیوں کا بزور شمشیر قلع قمع کر چکا تھا لیکن ملک میں جو عام بے چینی پیدا ہوئی تھی، وہ کچھ تو نزول باراں اور عمدہ پیداوار نے رفع کی اور زیادہ تر نئے سلطان کی نرمی اور اعتدال پسندی نے اس کا اثر دلوں سے محو کرادیا[1]۔ بایں ہمہ، حکومت دہلی میں اب یہ قوت نہ تھی کہ دکن اور بنگال کے بعید صوبوں کو جبراً دوبارہ اپنا مطیع بنا لیتی، اور گو بنگالے پر دو مرتبہ خود سلطان نے فوج کشی کی لیکن جیسا کہ ہم پہلے پڑھ چکے ہیں آخر کار دربار دہلی نے اس کی آزادی تسلیم کر لی۔

[1] فیروز شاہ نے عہد محمد شاہی کے تمام زائد محصولات اور ابواب منسوخ کر دیے اور مزارعین کو آباد کرنے کے ساتھ خاص طور پر ایسے قوانین بھی نافذ کیے کہ رعایا کو سرکاری مطالبات کا ٹھیک ٹھیک علم ہو جائے اور ماتحت عہدہ داروں کو ستانے کا موقع نہ مل سکے۔

باب ۳ — ہمعصر مورخ

اس سیاسی نقصان سے قطع نظر، عہد فیروز شاہی کی تاریخ شمالی ہند کی عام فراغت و خوش حالی کی دلکش تصویر ہے اور اس اعتبار سے اگر اس کا درباری مورخ دعویٰ کرتا ہے کہ "عہد دولتِ فیروز شاہ چناں یادگار ماند کہ ہرگز فراموش نشود" تو یہ محض شاعرانہ مدح نہیں ہے۔ بلکہ اول تو ان جزئیات سے جو اس مورخ شمس سراج عفیف نے ضمناً بے کم و کاست بیان کر دی ہیں عام امن و آسودگی کی تصدیق ہوتی ہے۔ نیز خود سلطان فیروز شاہ نے جو اصول حکومت اور واقعات "فتوحاتِ فیروز شاہی"[1] میں بیان کئے ہیں بالواسطہ مذکورۂ بالا قول کی تائید کرتے ہیں۔ دوسرے تغلقوں کا دور ختم ہونے کے بعد کی جو کتابیں محفوظ ہیں ان کی شہادت پیش کرتے وقت ہمیں کسی بیجا پاسداری کا شبہ نہیں ہو سکتا۔ ان میں "تاریخ مبارک شاہی" قابل ذکر ہے جس کا مؤلف غالباً سلطان فیروز شاہ کے آخری عہد میں خاص دہلی میں موجود تھا[2]، مگر اس نے اپنی کتاب فیروز شاہ کی وفات کے بہت عرصہ بعد (۸۳۸ھ-۱۴۳۴ء) میں تالیف کی تھی جبکہ دہلی میں خاندان سادات کے بادشاہ فرماں روا تھے۔

عام فراغت و آسودگی۔

انھی سیدوں کے عہد میں اطالی سیاح نکولوڈی کونٹی ہندوستان آیا تھا۔ (۱۴۲۰ء-۱۴۲۴ء) اور اس نے گجرات و دوآب کی زرخیزی، کثرت آبادی، عام دولتمندی اور خوش حالی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ گویا تاریخ فیروز شاہی کی بہترین تصدیق ہے وہ بیان کرتا ہے کہ گنگا کے دونوں کناروں پر برابر بستیوں کا سلسلہ چلا جاتا ہے جو ہر طرف سے خوبصورت باغات اور تاکستانوں میں گھری ہوئی ہیں[3]۔

باغات کی یہ ترقی خاص طور پر عہد فیروز شاہی کی یادگار معلوم ہوتی ہے

---

[1] - اس کتاب کا قلمی نسخہ ایڈورڈ ٹامس کو مل گیا تھا، اور اسی کا انگریزی میں خلاصہ الیٹ کی تاریخ ہند میں شامل کر دیا گیا ہے (جلد سوم صفحہ ۳۷۴ وغیرہ) لیکن اس کتاب کا پورا مضمون سلطان فیروز شاہ نے دہلی کی جامع مسجد کے گنبد پر کندہ کرا دیا تھا اور غالباً عہد اکبری تک یہ کتبہ موجود تھا۔ (دیکھو فرشتہ ۱۵۰ طبقات اکبری حالات سلطان فیروز شاہ)

[2] - الیٹ جلد چہارم صفحہ ۶۔

[3] - الفنسٹن صفحہ ۴۷۷۔

کیونکہ گوکھپور، انگور اور نیشکر کی وسیع پیمانے پر کاشت کرانے کا سلطان محمد تغلق نے منصوبہ باندھا تھا۔ اور خاص اسی غرض سے ایک علاحدہ محکمہ بھی قائم کر دیا تھا[1]، لیکن وہ اپنی زندگی میں اس پر خاطر خواہ عمل نہ کر سکا، اور شاید اس کے تمام منصوبوں میں یہی منصوبہ ایسا تھا جس کی عہد فیروز شاہی میں ایک حد تک تکمیل ہوئی چنانچہ صرف دہلی کی نواح میں بارہ سو نئے باغات و تاکستان تیار ہو گئے اور ہندوستان میں بھی عمدہ سے عمدہ قسم کا انگور پیدا ہونے لگا[2]۔

زراعت کی ترقی اور آب پاشی کے لیے جا بجا پانی کے بند باندھے گئے تھے جن کی تعداد پچاس بتائی گئی ہے۔ افسوس ہے کہ ان کے مفصل حالات و مقامات معلوم نہیں کہ جو فائدہ ان سے پہنچا اس کا صحیح اندازہ ہو سکتا لیکن اس عہد کی مشہور نہر جو حصار کے علاقے میں کھودی گئی تھی، آج بھی موجود ہے اور کم سے کم ایک سو پچاس میل لمبی تھی[3]، جس سے قیاس ہوتا ہے کہ یہ کام کس پیمانے پر انجام دئے جاتے تھے۔

اس غیر آباد علاقے میں خود یہ شہر (حصار فیروزہ) سلطان فیروز تغلق نے تعمیر کیا تھا اور ابھی تک جنوبی پنجاب کے مغربی اضلاع کا سب سے بڑا شہر ہے۔ اسی طرح کڑھے سے آگے بڑھ کر شہر جونپور کی بنیاد اسی بادشاہ نے رکھی جو کچھ عرصے بعد "سلطنت شرقی" کا پائے تخت ہو گیا۔ تاریخوں میں اور بھی کئی شہروں یا قلعوں کا ذکر آتا ہے جنھیں سلطان فیروز شاہ نے بنوایا یا از سر نو آباد کیا تھا اور فرشتہ نے اس کے "ذکر خیر" کو جن عمارات فیروز شاہی کی فہرست پر ختم کیا ہے ان میں بہت سی مسجدیں، مدرسے، دارالشفا اور حمام شامل ہیں کہ ان سے ہر خاص و عام مفت فائدہ اٹھاتا تھا اور تمام مصارف شاہی اوقاف سے ادا ہوتے تھے۔

---

[1] برنی، صفحہ ۴۹۸۔

[2] تاریخ فیروز شاہی (شمس سراج) صفحات ۲۹۵، ۲۹۶۔

[3] گزیٹیر جلد سوم صفحہ ۳۲۷۔

باب ۳

حکومت کی کمزوری

اس عام فراغت و آسودگی اور سلطان کی رعایا پروری کے باوجود اس کے آخری زمانے میں حکومت دہلی کی سیاسی قوت میں زوال آگیا۔ یعنی بوڑھے بادشاہ کی نیک دلی اور کمزوری سے چالاک درباریوں کو فائدہ اٹھانے کا موقع ملنے لگا اور خان جہاں وزیر سلطنت کے تمام کاروبار پر حاوی ہوگیا۔ سلطان کی اولاد اور اعزا کو خان جہاں کا اقتدار کھٹکتا رہتا تھا اور اسی باہمی حسد کی وجہ سے دربار دہلی میں آئے دن سازشیں ہوتی رہتی تھیں۔ حتیٰ کہ سلطان فیروز شاہ نے ان جھگڑوں سے تنگ آکر اپنی وفات سے کچھ مدت پہلے تمام اختیارات شاہی تغلق شاہ بن فتح خاں کے سپرد کردیے تھے اور سلطان کے انتقال کے بعد وہی تخت دہلی کا وارث ہوا (رمضان سنہ ۷۹۰ھ (۱۳۸۸ء))۔

لیکن اس ہردلعزیز بادشاہ کے مرتے ہی وہ خانگی جھگڑے اور بڑھ گئے اور کئی بار دہلی اور نواح دہلی میں سخت لڑائیاں ہوئیں، جن میں تخت دہلی پر کبھی ایک حریف کا قبضہ ہوجاتا تھا کبھی دوسرے کا۔ چنانچہ صرف سات برس میں پانچ بادشاہ یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے[1] اور ہم بہ آسانی اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس عزل و نصب اور خانہ جنگی نے حکومت دہلی کی مرکزیت کو کس قدر نقصان پہنچایا ہوگا۔ گزشتہ چالیس برس کے امن اور عام خوش حالی نے بڑے بڑے صوبہ داروں کو پہلے ہی بہت دولت مند اور طاقت ور بنا دیا تھا۔ پائے تخت کے ان ہنگاموں نے انھیں خود مختاری کی تحریک دلائی اور ادھر سلطنت دہلی کی وقعت اور جنگی قوت کا خوف ان کے دل میں باقی بھی تھا تو اسے امیر تیمور کے حملے نے زائل کردیا۔

[1] سلطان فیروز شاہ کا پہلا جانشین اس کے بڑے بیٹے فتح خاں کا فرزند تھا۔ وہ چند مہینے کی بادشاہی کے بعد حریفوں کے ہاتھ سے مارا گیا اور امرا نے سلطان فیروز شاہ کے دوسرے پوتے ابوبکر بن ظفر خاں بن فیروز شاہ کو تخت پر بٹھایا مگر سال آئندہ اس کے چچا ناصرالدین محمد بن فیروز شاہ نے سلطنت چھین لی اور خود چند سال حکومت کرنے کے بعد سنہ ۷۹۶ھ (۱۳۹۴ء) میں وفات پائی۔ اس کا بیٹا ہمایوں خاں الملقب بہ سکندر شاہ باپ کا جانشین ہوا تھا لیکن چند ہی روز میں بیمار ہوکر مرگیا اور امرا نے بہت کچھ بحث مباحثے کے بعد اس کے بھائی محمود کو منتخب کیا جس نے باپ کا لقب "ناصرالدین" بھی اپنے نام کے ساتھ بڑھا لیا تھا۔

باب امیر تیمور کا حملہ

ماوراء النہر کا یہ مغل فرماں روا، جس کی حیرت انگیز فتوحات نے عہد چنگیز خانی کی یاد تازہ کر دی تھی، نویں صدی ہجری کے عین آغاز میں ہندوستان آیا اور شمالی سندھ و پنجاب کے اضلاع کو پامال کرتا ہوا پہلے پانی پت کے قریب دریائے جمنا سے اتر کر موجودہ مظفر نگر اور میرٹھ کے اضلاع میں داخل ہوا اور وہاں سے پھر پلٹ کر شہر دہلی کے جنوب میں اس نے دوبارہ دریا کو عبور کیا اور بہت معمولی لڑائی کے بعد شہر پر قابض ہو گیا۔ (جمادی الاول ۸۰۱ھ ۱۳۹۹ء)

سلطنت دہلی کا نام نہاد سلطان ناصر الدین محمود شاہ اور اس کا وزیر ملو اقبال خاں پائے تخت سے موقع پا کر نکل گئے تھے گو معززین شہر کی درخواست پر اہل دہلی کو امان دے دی گئی نیز مسجد جامع میں امیر تیمور صاحبقراں کے نام کا خطبہ پڑھا گیا، بایں ہمہ تیموری سپاہیوں نے مقررہ فدیہ وصول کرنے میں جو سختی کی اس کی وجہ سے اہل شہر بگڑ گئے اور بعض مقامات پر کشت و خون کی نوبت پہنچی۔ تیمور کے لیے اتنا بہانہ کافی تھا۔ اس نے اعلان کرا دیا کہ شہر کے تمام باشندے فتحمند سپاہ کے قیدی ہیں؛ جو گویا قتل عام اور لوٹنے کی اجازت تھی۔[1]

واضح رہے کہ پائے تخت دہلی اس وقت کئی شہروں کا مجموعہ تھا اور اس میں ایسی بے شمار سنگین عمارات موجود تھیں جن کی پناہ میں مدافعانہ جنگ کر سکتے تھے۔ پھر بھی ہزار ہا لوگ ایسے تھے جنھیں مغلوں نے بلا وقت تاراج کر دیا اور جب لوٹتے لوٹتے دل بھر گیا تو جا بجا آگ لگا دی۔

اس جگہ یہ صراحت کر دینی چاہیے کہ گو امیر تیمور چنگیز خاں کی اولاد میں نہ تھا نہ وہ اور اس کے سپاہی چنگیزیوں کی مثل بت پرست اور وحشی تھے۔

---

[1] اس واقعے کی بعض اہم جزئیات میں راویوں کا اختلاف ہے۔ ظفر نامہ کا مؤلف تیمور کی پاسداری کرتا ہے اور تاریخ مبارک شاہی میں اس واقعے کو بہت اختصار سے لکھا ہے۔ (ترجمۂ انگریزی، ایلیٹ جلد چہارم) محمد قاسم فرشتہ کا نانا حملۂ تیموری کے وقت لاہور میں موجود تھا لہذا فرشتہ نے یہ حالات بہت تفصیل سے لکھے ہیں، بایں ہمہ غالباً سب سے محققانہ بیان صاحب طبقات اکبری کا ہے اور ہم نے اختلافی روایات میں اسی کی پیروی کو ترجیح دی ہے۔

باب

پھر بھی ان تو مسلوں میں "مغول" کا نسلی اثر بالکل نہیں مٹ گیا تھا اور خود تیمور کو (جس کی جوانی میں دینداری اور نیک دلی کی شہرت تھی) ہوس کشور کشائی نے سخت بے رحم و بے اصول بنا دیا تھا۔ مذہبی نقطۂ نظر سے، ہندوستان کی اسلامی سلطنت پر اس کا حملہ کرنا سراسر ناجائز تھا۔ اور سیاسی اعتبار سے بھی اس یورش سے کوئی مفید نتیجہ نکلنے کی توقع نہ ہوسکتی تھی: بابر نے انھی "تیموری فتوحات" کی بنا پر پنجاب و دہلی کی وراثت کا جو دعویٰ کیا وہ بہت بعد کی بات ہے ورنہ وقت کے وقت ہندوستان کے مسلمان حکام اور ان کی ہندو رعایا کو تیموری حملے سے شدید مصائب و نقصان کے سوا کوئی فائدہ نہیں پہنچا اور گویا پائے تخت دہلی کی تباہی کے ساتھ، ملک ہند کے رہے سہے سیاسی اتحاد کا شیرازہ بکھر گیا۔

صوبوں کی خودمختاری

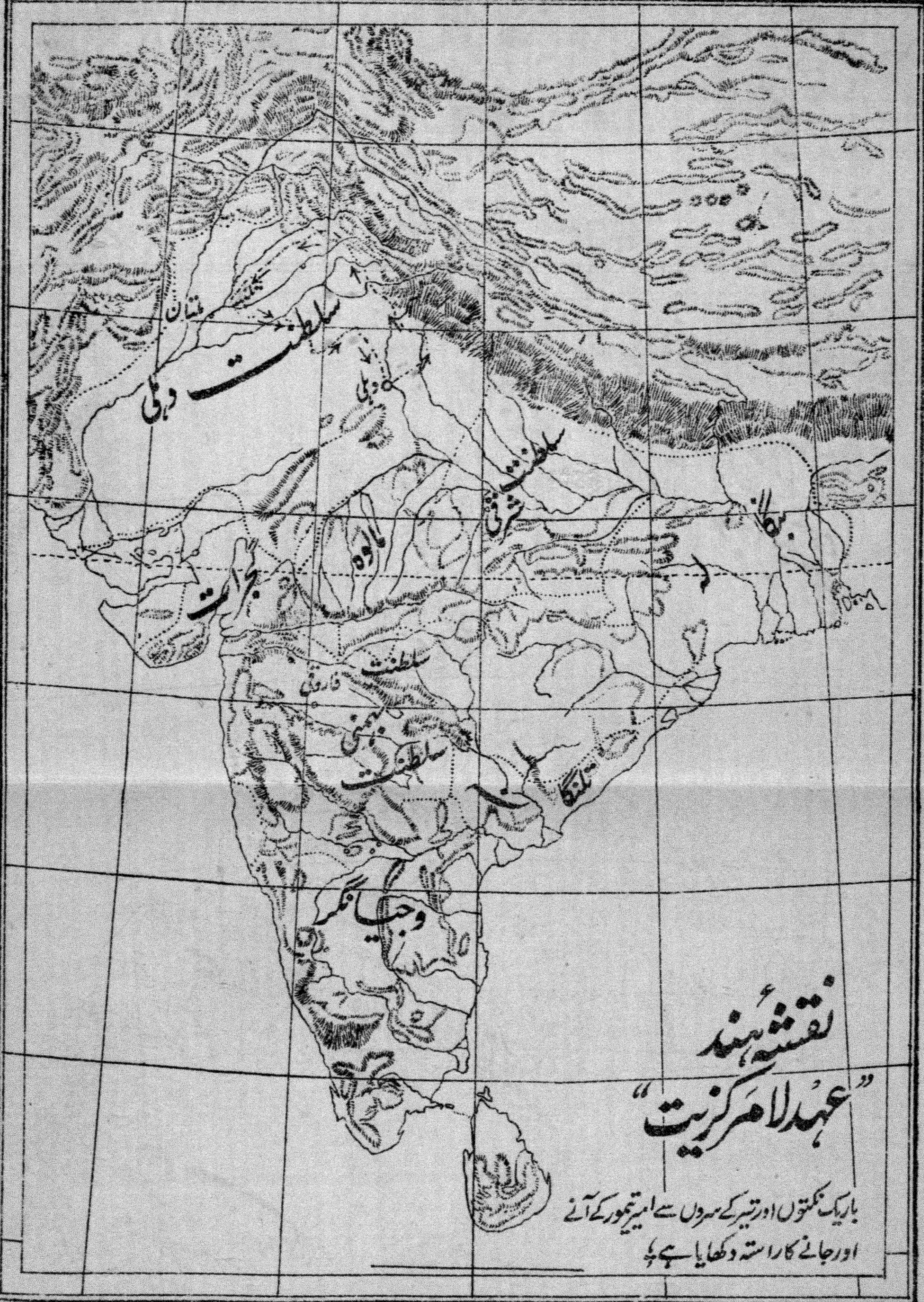
دہلی کی تاراجی کے بعد امیر تیمور بہت جلد اپنے دارالسلطنت سمرقند کو واپس چلا گیا[1] اور پنجاب و ملتان کے صوبے دربار دہلی کے ایک امیر سید خضر خاں کے حوالے کر گیا جس نے کچھ عرصے بعد (۱۴۱۴ء ۸۱۷ھ میں) دہلی پر قبضہ کر کے خاندان سادات کی چند روزہ سلطنت کی بنیاد رکھی تھی لیکن ان کمزور بادشاہوں کے بعد بھی جب کہ بہلول لودھی نے جونپور کی ریاست کو دوبارہ فتح کر کے حکومت دہلی کا ماتحت بنایا اس وقت یہ سلطنت حقیقت میں شمالی ہند کی صرف ایک بڑی ریاست رہ گئی تھی جسے بعض اوقات پنجاب و راجپوتانہ کی مقامی بغاوتیں فرو کرنی تک دشوار ہو جاتی تھیں۔ اور دور کے تمام بڑے صوبے اس کے تسلط سے بالکل آزاد تھے۔

جونپور کی سلطنت شرقی

ان صوبوں میں بنگال اور دکن کی خودمختاری کا حال پہلے ہماری نظر سے گزر چکا ہے۔ رجب ۷۹۶ھ ۱۳۹۴ء میں محمود شاہ تغلق کی تخت نشینی کے وقت ایک خواجہ سرا ملک سرور کو "ملک الشرق" کا لقب دے کر حکومت دہلی نے جونپور بھیجا تھا کہ

---

[1] بے حساب مال غنیمت کے علاوہ، امیر تیمور دہلی کے سنگ تراشوں کو بھی پکڑ کر اپنے ساتھ لے گیا تھا کہ اپنے پائے تخت میں سلطان محمد تغلق کی جامع مسجد کے نمونے پر ترشے ہوئے پتھروں کی مسجد بنوائے (فرشتہ صفحہ ۱۵۸)۔


سلطنت دہلی
ملتان
دہلی
سلطنت شرقی
مالوہ
بنگال
گجرات
سلطنت فاروقی
سلطنت بہمنی
وجیانگر
نقشۂ ہند
"عہد لامرکزیت"
باریک نکتوں اور تیر کے سروں سے امیر تیمور کے آنے
اور جانے کا راستہ دکھایا ہے۔

باب ۳

دوآب کی شورشوں کا انسداد کرے۔ اس نے صدر حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر بتدریج 'کڑہ' 'اودھ' اور بہرائچ کے اقطاع بھی اپنے قبضے میں لے لیے شمال میں ترہٹ اور مغرب میں بہار کے بعض اضلاع کا اپنی ریاست سے الحاق کیا اور تاریخ مبارک شاہی کا بیان ہے کہ جاج نگر کے راجہ اور لکھنوتی کے بادشاہ سے بھی اس نے خراج وصول کیا۔[1] بہرحال اس کی خودمختاری میں اب کوئی کسر باقی نہیں تھی لیکن وہ باضابطہ اپنی بادشاہی کا اعلان نہ کرنے پایا تھا کہ ۸۰۲ھ/۱۳۹۹ء میں مرگیا اور یہ رسم اس کے پسر خواندہ کی جانشینی کے وقت پوری ہوئی جس نے "سلطان مبارک شاہ شرقی" کے لقب سے اپنا خطبہ اور سکہ جاری کیا (۸۰۳ھ/۱۴۰۰ء) اور جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے' اس سلطنت کا خاتمہ سلطان بہلول لودھی کے ہاتھ سے ہوا (۸۸۳ھ/۱۴۷۹ء)۔

خاندیس کی سلطنت فاروقیہ

صوبۂ خاندیس جونپور سے بھی پہلے قریب قریب خودمختار ہوگیا تھا اور ملک راجہ فاروقی نے 'جو دربار دہلی کے ایک قدیم خاندان امراء سے تھا' سلطان فیروز شاہ تغلق ہی کے اخیر زمانے میں یہاں موروثی حکومت کی بنیاد ڈال دی تھی اور اسی سلطان کی وفات کے بعد سے "سلطنت فاروقیہ" کو آزاد سمجھنا چاہئے (۷۹۰ھ/۱۳۸۸ء) لیکن گو ملک راجہ کے جانشین سلطان نصیر شاہ فاروقی اور پھر سلطان عادل شاہ فاروقی کے عہد حکومت میں یہ ریاست نہایت دولتمند اور قوی ہوگئی تھی اور وسط ہند (گونڈوانہ) کے بڑے بڑے رئیس اس کے خراج گزار تھے' بایں ہمہ مالوے اور گجرات کی خودمختار ریاستوں نے اور جنوب میں سلاطین دکن نے اسے مستقل طور پر زیادہ وسیع نہ ہونے دیا اور ایسے طاقتور حریفوں کے مقابلے میں یہاں کے بادشاہوں کی یہی کامیابی کچھ کم نہیں تھی کہ دو سو برس تک خاندیس خاص کے علاقے میں آزادانہ حکومت کرتے رہے حتیٰ کہ فتوحات اکبری کا سیلاب جو مالوے اور گجرات کے بادشاہوں سے نہ رک سکا تھا' سلطنت فاروقیہ کو بھی بہا لے گیا۔ (۱۰۰۹ھ/۱۶۰۱ء)۔

مالوہ اور گجرات

مالوے اور گجرات رقبے میں خاندیس سے بڑے اور بہت زرخیز و آباد صوبے تھے۔

[1] ترجمۂ انگریزی' ایلیٹ جلد چہارم صفحہ ۲۹ طبقات اکبری اور فرشتہ نے بھی اسی تاریخ کے حوالے سے یہ روایت نقل کی ہے۔

باب

لیکن یہاں کے صوبہ دار دلاور خاں اور ظفر خاں، تیموری حملے کے بعد بھی کچھ عرصے تک محمود شاہ تغلق کی اطاعت کا دم بھرتے رہے۔ آخر ۸۱۰ھ/۱۴۰۷ء میں ظفر خاں نے مظفر شاہ کے لقب سے باضابطہ اپنی بادشاہی کا اعلان کیا اور اس کے دو سال بعد دلاور خاں غوری کا بیٹا سلطان ہوشنگ شاہ کے لقب سے مالوے میں خود مختار ہو گیا۔

اس دور کی خصوصیات

ان آزاد ریاستوں کے تفصیلی حالات بیان کرنے کی اس کتاب میں گنجائش نہیں ہے اور یہاں ہم ہندوستان کے اس "دور لامرکزیت" پر صرف ایک اجمالی نظر ڈال سکیں گے کہ کم سے کم ایک سرسری اندازہ کیا جا سکے کہ اس ڈیڑھ یا دو سو برس کے عرصے میں جبکہ مسلمانان ہند کا سیاسی شیرازہ بکھر گیا تھا، انھوں نے "ملوک طوائف" کی حیثیت سے اس ملک میں کیا کام کیا؟

(۱) لوازم بادشاہی

یہ ظاہر ہے کہ ہر صوبہ دار جو آزاد ہوا، اپنے اپنے مقام پر خود مختار بادشاہی کے وہ تمام لوازم جمع کرنا چاہتا تھا، جو پہلے صرف سلاطین دہلی کو مہیا کرنے پڑتے تھے۔ بہ الفاظ دیگر، عالیشان محلات، گراں بہا لباس و زیورات، بہتر سے بہتر سواریاں، درباری آرائش و تجمل کے بیش قیمت ساز و سامان، بادشاہی کارخانے، محکمے اور آئین، اور اسی طرح شاہانہ تزک و احتشام کے بے شمار اسباب جن کی بحیثیت صوبہ دار ضرورت نہ تھی، اب یہ "ملوک طوائف" نہایت اہتمام کے ساتھ فراہم کرتے تھے بلکہ سچ پوچھئے تو حصول حکومت و آزادی کی آرزو کو یہی جذبۂ شوکت نمائی تقویت پہنچاتا تھا اور خود مختاری کا اعلان کرنے سے پہلے ہی یہ نئے بادشاہ کوشش کرتے تھے کہ جاہ و جلال کے اعتبار سے ان کا دربار حتی الامکان بلبن و علاء الدین کے دربار سے کمتر نہ رہے۔

ان لوازم بادشاہی میں، بڑی بڑی فوجیں اور جنگی ساز و سامان کی ہمسائی گویا سب سے ضروری مد تھی کہ ہمسایوں سے اپنی سلطنت کو بچایا جائے اور جب موقع ملے نئے علاقے حاصل کئے جائیں چنانچہ اس ہوس ملک گیری کی بدولت ان ریاستوں میں جن کی سرحدیں متصل تھیں آئے دن لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ خانہ جنگی، اندرونی انقلابات اور سازشوں کے بھی بہت سے قصے

اب

تاریخوں میں محفوظ ہیں۔

(۲) مالی ترقی

مگر تاریخ ہند کے طالب علم کو خاص طور پر جو بات یاد رکھنی چاہئیے وہ یہ ہے کہ مذکورۂ بالا جنگی ساز و سامان یا لوازم بادشاہی کے واسطے زرکثیر کی ضرورت پڑتی تھی اور یہ چھوٹے چھوٹے بادشاہ گویا مجبور تھے کہ ملکی دولت و ثروت کو ہر ممکن طریقے سے ترقی دیں تاکہ خود انھیں شاہانہ حوصلے نکالنے کا موقع ملے! اور گو فارسی تاریخوں میں اس موضوع پر کوئی توجہ نہیں کی جاتی، بایں ہمہ نہ صرف خارجی واقعات و قراین بلکہ بعض صریحی شہادتیں موجود ہیں کہ ان ملوک طوائف نے اکثر اپنے اپنے ملک میں زراعت و باغبانی، صنعت و تجارت کو ترقی دینے کی کوشش کی[1] اور مجموعی طور پر ہندوستان کی دولت پہلے کی نسبت بدرجہا بڑھ گئی جس کے بغیر بڑی بڑی فوجوں کا مہیا کرنا، شاہانہ عشرت و آرائش کے سامان کی فراہمی اور عالیشان عمارات اور شہروں کی تعمیر محال تھی۔

(۳) نئے شہر اور عمارات۔

دوسرے یہی زمانہ ہے جس میں اسلامی تمدن ہندوستان کے اکثر حصوں میں رائج ہوا اور ان ملوک طوائف کی بدولت جا بجا نئے شہر آباد ہوئے جو صنعت و تجارت اور اسلامی علوم و فنون کا مرکز تھے۔ واضح رہے کہ ان میں سے اکثر بستیاں پہلے سے موجود تھیں لیکن مسلمانوں نے وہاں وسیع شہرپناہیں، عالیشان قلعے، مساجد و مدارس اور بڑے بڑے بازار بنا کر ان کی بالکل صورت بدل دی اور گمنام دیہات کی بجائے انھیں بارونق شہر بنا دیا۔ چنانچہ بنگالے میں لکھنوتی (یا گور) اکدالہ، پنڈوہ، سنارگام اور ساتگام اسی قسم کے شہر تھے جنھیں مسلمان بادشاہوں نے از سر نو تعمیر کیا اور زیر نظر زمانے میں ان کی آبادی پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی[2] دکن میں دولت آباد اور گلبرگہ اور بیدر کے

---

[1] دکن اور گجرات میں میوہ دار درختوں کے غیر ملکوں سے لانے اور غلہ و نیشکر کی کاشت بڑھانے کے واسطے جو اہتمام کیا جاتا تھا اس کی مثال کے واسطے دیکھو فرشتہ ۳۲۵۔ رسالہ یادِ ایام (اردو) صفحہ ۳۲ و ۴۲ بحوالۂ مرآۃ سکندری وغیرہ۔

[2] اسی زمانے میں پرتگیز سیاحوں نے شہر لکھنوتی کی آبادی کا تخمینہ کیا تھا کہ اس میں کم و بیش دس لاکھ آدمی بستے تھے! (دیکھو راورٹی حاشیہ صفحہ ۵۸۲)

باب ۳

عروج کا یہی زمانہ ہے جو پہلے محض جنگی قلعے تھے اور سلاطین بہمنی کے عہد میں نہایت آباد و بارونق شہر بن گئے۔ ان بادشاہوں نے اوسہ اور پرینڈہ میں جو قلعے بنائے تھے وہ آج بھی فن حرب میں ان کی مہارت کی لاجواب یادگار ہیں[1] اور گاوِل گڑھ اور نرنالہ (برآر) کے قلعوں کو دیکھ کر میڈوز ٹیلر کو بھی بے اختیار اقرار کرنا پڑا کہ تمام ممالک یورپ اس زمانے میں ایسی پرشکوہ اور خوشنما عمارات کا جواب پیش کرنے سے عاجز ہیں[2]۔

ان کے قریب ہی خاندیس میں نصیر خاں فاروقی نے شہر برہان پور کو نویں صدی ہجری کے آغاز میں آباد کیا اور وہ بہت جلد وسط ہند کی تجارت اور اسلامی تمدن کا مشہور مرکز بن گیا۔ زین آباد اور سلطان پور کے نئے اسلامی شہروں کا بھی بار بار ذکر آتا ہے مگر اب وہ کس مپرسی اور گمنامی کی حالت میں ہیں اور یہی حال مانڈو، سارنگ پور وغیرہ شہروں کا ہوا جو اس زمانے میں مالوے کے اسلامی سلاطین نے تعمیر کئے تھے۔ ان بادشاہوں کی بنائی ہوئی سنگین اور مستحکم عمارات جو اب تک شناخت کی جاسکتی ہیں، بے شمار اور فن عمارت کی بہت سی خوبیاں رکھتی ہیں" اور حال میں ریاست دھار اور سرکار انگریزی کی توجہ سے ان میں سے اکثر عمارات کی مرمت و نگہداشت کا انتظام کیا گیا ہے[3]۔

لیکن تمدنی ترقی کی اس تگاپو میں غالباً گجرات سب سے آگے تھا جہاں مسلمان بادشاہوں کی سعی و سرپرستی سے زراعت و باغبانی، صنعت و حرفت بری و بحری تجارت، علوم و فنون اور مدنیت و آبادی نے حیرت انگیز فروغ حاصل کیا۔

یہاں کے پرانے اور گمنام شہروں کو مسلمانوں نے از سر نو آباد کیا اور جا بجا نئے قصبات اور بندرگاہیں بنائیں جن کی تجارت اور مصنوعات دور دور کے ملکوں میں مشہور تھیں۔ نویں صدی ہجری کے اخیر میں یورپ کے سیاح اور تاجر

---

[1] اوکسفورڈ ہسٹری، صفحہ ۲۸۴

[2] " " ، صفحہ "

[3] " " " ۲۶۷۔

باب ۳

بھی روز افزوں تعداد میں ہندوستان آنے لگے تھے اور ان کی تحریروں میں سب سے زیادہ گجرات کی کثرتِ آبادی، دولتمندی اور خوش حالی کی شہادتیں محفوظ ہیں جس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انھیں زیادہ تر ہندوستان کے مغربی سواحل اور سلطنتِ گجرات ہی کے دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ ان تحریروں کے علاوہ گجرات کی قدیم عمارات گویا اس عہد کی آسودگی، حسنِ ذوق اور ہنرمندی کی زندہ یادگاریں ہیں حتیٰ کہ ونسنٹ اسمتھ بھی جس نے مسلمان بادشاہوں کی ہر جگہ ناروا مذمت کی ہے، یہ لکھے بغیر نہ رہ سکا کہ "شہرِ احمد آباد اپنے عروج کے زمانے میں یعنی بننے کے بعد سے اٹھارھویں صدی (عیسوی) تک (گویا تقریباً تین صدی تک) بے شک و شبہہ دنیا کے سب سے خوبصورت شہروں میں داخل تھا۔ اس کی (ان دنوں) آبادی نو لاکھ بیان کی جاتی ہے اور وہاں کے تاجروں میں کروڑپتی سوداگر بھی موجود تھے۔" [1]

(۴) ترقی علوم

"سلطنتِ شرقی" اور سیاسی زوال اور تیموری تباہی کے باوجود سلطنتِ دہلی بھی مجموعی طور پر، تمدن میں اپنے معاصرین سے پیچھے نہ تھی لیکن حق یہ ہے کہ جونپور کے قابل دید آثارِ قدیمہ سلاطینِ شرقی کی بہت ادنیٰ یادگاریں ہیں ورنہ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اودھ سے جونپور تک سارے ملک کو اربابِ علم و فضل سے معمور کر دیا۔ تعلیم کا سب سے بڑا مرکز تو خاص شہر جونپور تھا، لیکن صدہا علما اور مشائخ کو دیہات بطریق جاگیر دے دئے گئے تھے کہ وہ اور ان کے شاگرد اطمینان سے وہاں رہ کر علمی مشاغل میں اپنی زندگی بسر کریں۔ اہلِ علم کی یہی بستیاں اور نو آبادیاں تھیں جن کی وجہ سے شاہجہاں جیسا عالی نظر بادشاہ، ان علاقوں پر فخر کرتا تھا۔ اور کہا کرتا تھا کہ "پورب شیرازِ ماست!" اور آج بھی جب کہ مشرقی علوم کی کساد بازاری انتہا کو پہنچ گئی ہے اور علما کے قدیم خاندان کس مپرسی کی بدولت تباہ و شکستہ حال ہیں، "پورب" یعنی قدیم "سلطنتِ شرقی" کے وہ اسلامی قصبات مردم خیزی میں ضرب المثل ہیں۔

[1] آکسفورڈ ہسٹری، صفحہ ۲۷۱۔

باب ۳

جہاں اسی دور رفتہ میں اسلامی علما آکر آباد ہوئے تھے۔

اس کتاب میں زیر نظر عہد کے اسلامی مدارس، صوفیہ، علما، شعرا اوران کی تصانیف کا احاطہ کرنا غیر ممکن ہے۔ لیکن سرسری طور پر یہ بیان کرنا بے محل نہ ہوگا کہ خواجہ نصیر الدین (چراغ دہلوی)، حضرت مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ (منیری) اور خواجہ سید محمد گیسو دراز جیسے صاحب ارشاد و تصانیف بزرگوں کا زمانہ یہی ہے۔ ملک العلماء قاضی شہاب الدین (جونپوری) شیخ علی بن شیخ احمد (مہائمی)، اور سب سے بڑھ کر شیخ علی متقی (برہانپوری)[۱] کی وہ فاضلانہ تصانیف جو آج بھی اسلامی دنیا میں مقبول و محترم ہیں، ہندوستان کے اسی "دور لامرکزیت" میں شائع ہوئیں۔ جو طالب علم ان علماء اور ان کے معاصرین کی علمی مرتبت کا صحیح اندازہ کرنا چاہتے ہیں وہ اگر خود ان کی تصانیف سے مستفید نہ ہوسکیں تو کم ازکم ان مستند تذکروں[۲] کا مطالعہ کریں جو خاص ان بزرگوں کے حالات میں لکھے گئے تھے اور بعض کا اردو میں ترجمہ یا خلاصہ طبع ہوگیا ہے۔

ہندوؤں سے علمی تعلقات

مگر علمی ترقی کے اس مختصر بیان کو ختم کرتے وقت یہ بتانا ضروری ہے کہ شمالی ہند کے ہندو مسلمانوں میں ہم وطنی کا عام احساس اسی زمانے میں پیدا ہوا۔ امیر خسرو نے ہندی زبان اور علوم کی جانب توجہ دلانے کی جو کوشش کی تھی، وہ بیکار نہ گئی۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے مسلمان طلبہ کی معقول جماعت کو سنسکرت اور ہندو علوم کے سیکھنے کا شوق ہوگیا۔ سلطان فیروز شاہ نے جس وقت قلعہ نگر کوٹ کو فتح کیا (۱۳۶۱ء ۷۶۲ھ) اور معلوم ہوا کہ وہاں سنسکرت کتابوں کا بہت قدیم اور عمدہ ذخیرہ موجود ہے تو حکم دیا کہ ان میں سے بہترین کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا جائے۔ چنانچہ دربار کے مشہور منشی عز الدین نے

---

[۱] ان کی کتاب کنز العمال، جس میں علامہ سیوطی کی "جمع الجوامع" کو از سر نو ابواب فقہیہ پر ترتیب دیا ہے، دائرۃ المعارف حیدرآباد میں طبع کی گئی ہے۔ فاضل مؤلف کی اسی علمی خدمت کی بنا پر یہ قول مشہور ہوا کہ للسیوطی منۃ علی العالمین وللمتقی منۃ علیہ!

[۲] اخبار الاخیار اور علامہ غلام علی آزاد کی تصانیف کا ہم پہلے حوالہ دے چکے ہیں۔ علمائے جونپور و دہلی کے حالات میں بہت سے عمدہ عمدہ تذکرے فارسی میں موجود، اور ان میں گنج رشیدی، فصول مسعودیہ وغیرہ مشہور ہیں۔

ہندی فلسفہ و نجوم وغیرہ علوم کے جو ترجمے کئے ان کا مجموعہ "دلائل فیروزی" کے نام سے موسوم ہے اور ملا عبد القادر نے اس کو نقادانہ نظر سے مطالعہ کیا تھا۔[1] اسی عہد کی دو نادر ضخیم علمی کتابوں کو سر ہنری ایلیٹ نے لکھنؤ کے ایک کتب خانہ میں دیکھ کر یہ رائے قائم کی تھی کہ "بے شبہہ اس زمانے میں (مسلمان علما) عام طور پر سنسکرت کا کافی علم رکھتے تھے"[2] ہندوؤں کے طبی علوم سے مسلمانوں نے جس قدر واقفیت بہم پہنچائی تھی اس کے ثبوت میں غالباً صرف ایک کتاب "معدن الشفا" کا حوالہ دینا کافی ہوگا جو چرک، جالوکرن، بھوج، سارنگ دھر وغیرہ تیرہ نامور ہندو اطبا کی مستند سنسکرت تصانیف کا خلاصہ ہے اور فاضل مؤلف نے، تشریح اعضا، امراض، علاج اور خواص ادویہ کے متعلق گویا ہندو اساتذہ کی تمام قدیم تحقیقات کا فارسی میں عطر کھینچ لیا ہے۔[3]

اس عالمانہ کتاب کا مؤلف سلطان سکندر لودھی کے دربار کا امیر تھا اور اس عہد کی علمی سرگرمی[4] نیز ہندوؤں کا اسلامی علوم حاصل کرنا تاریخ کا مشہور واقعہ ہے لیکن یہاں یہ دلچسپ نظیر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اس عہد میں ایک ہندو برہمن نے علوم اسلامی میں اتنی دستگاہ حاصل کر لی تھی کہ نہ صرف فارسی کا عمدہ شاعر تھا بلکہ (عربی) کتب علمی کا باقاعدہ درس دیا کرتا تھا۔[5] دکن کی نوخیز ریاست میں برہمنوں کی

---

[1] منتخب التواریخ صفحہ ۳۴۹۔ اس واقعے کا ذکر طبقات اکبری، فرشتہ وغیرہ بعد کی تمام فارسی تاریخوں میں بھی موجود ہے۔

[2] ایلیٹ، تاریخ ہند جلد پنجم صفحہ ۳، ۵۷۔

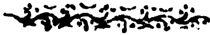
[3] یہ کتاب مطبع نول کشور سے [illegible] میں چھپ کر شائع ہو چکی ہے اور کتب خانہ آصفیہ میں اس کا نسخہ موجود ہے اگرچہ فہرست کتب میں غلطی سے اس کا نام "طب سکندری" لکھا ہے۔ مگر مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی کی عنایت سے اس کا ایک قدیم قلمی نسخہ بھی راقم الحروف کو دیکھنے کا موقع ملا۔ مؤلف کا عرف میاں بھووہ (بن خواص خاں) تھا جسے تاریخ فرشتہ میں غلطی سے بجودہ لکھ دیا ہے (صفحہ ۱۸۰) لیکن کتاب میں صاف صاف نام لکھے ہونے کے علاوہ مخزن افغانی (باب سوم فصل دوم و سوم) سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ "میاں بھووہ" سلطان سکندر کے مصاحب خاص اور میر عدل کے معزز عہدے پر ممتاز تھے۔ مطبوعہ کتاب کے سرورق پر مؤلف کا نام بہلول خاں تحریر ہے اور غالباً اصلی نام یہی ہوگا۔

[4] ملاحظہ ہو تاریخ فرشتہ صفحہ ۱۸۷۔

[5] آکسفورڈ ہسٹری، صفحہ ۲۶۴۔

باب ۳

جو قدر و منزلت ہوئی اس کا اشارۃً اوپر ذکر آچکا ہے[۱]۔ اور بعض سلاطین بنگالہ نے خاص طور پر مقامی زبان اور تعلیم کو ترقی دینے کی جو سعی کی تھی، ہمارے زمانے کے بنگالی اور انگریز مصنف بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں لیکن ہندو مسلمانوں کے میادلۂ خیالات اور باہمی میل جول بڑھنے کی شاید سب سے اچھی شہادت یہ ہوگی کہ رامانند کے شاگرد کبیر نے انھی لودھی سلاطین دہلی کے عہد میں اپنی صوفیانہ تعلیم دینی شروع کی اور اس بات کی کوشش کی کہ ہندو مسلمانوں کے اختلافات کو مٹا کر انھیں ایک کر دیا جائے۔



[۱] - دیکھو فرشتہ صفحہ ۱۸۸ منتخب التواریخ ۳۲۴ وغیرہ وغیرہ۔

تتمہ باب (۳)

۱۔ شاہان بہمنی کے نام اور سنین حکومت

نمبر	نام	سنہ جلوس	کیفیت
۱	سلطان علاء الدین حسن	سنہ ۷۴۸ھ / ۱۳۴۷ء	
۲	سلطان محمد شاہ بن علاء الدین۔	سنہ ۷۵۹ھ / ۱۳۵۸ء	
۳	سلطان مجاہد شاہ بن محمد شاہ۔	سنہ ۷۷۵ھ / ۱۳۷۳ء	
۴	سلطان داؤد شاہ بن علاء الدین	سنہ ۷۸۰ھ / ۱۳۷۷-۷۸ء	اپنے بھتیجے کو فریب سے مار کر بادشاہ ہوا تھا مگر بہت جلد خود بھی مارا گیا۔
۵	سلطان محمد شاہ ثانی	سنہ ۷۸۰ھ	
۶	سلطان غیاث الدین بن محمد شاہ ثانی	سنہ ۷۹۹ھ / ۱۳۹۷ء	غیاث الدین کو اندھا کر کے ایک امیر تغلچین سلطنت پر حاوی ہو گیا تھا اور شمس الدین بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔
۷	سلطان شمس الدین بن محمد شاہ ثانی	سنہ ۷۹۹ھ	

نمبر	نام	سنہ جلوس	کیفیت
۸	سلطان فیروز "روز افزوں" شاہ بن احمد خان (ہ)	سنہ ۸۰۰ھ / ۱۳۹۷ء	
۹	سلطان احمد شاہ بن احمد خاں	سنہ ۸۲۵ھ / ۱۴۲۲ء	بانی احمد آباد (بیدر) جس کے عہد میں سلطنت بہمنی نے کمال رونق حاصل کی۔
۱۰	سلطان علاء الدین بن احمد شاہ	سنہ ۸۳۸ھ / ۱۴۳۵ء	
۱۱	سلطان ہمایوں شاہ "ظالم" بن علاء الدین بن احمد	سنہ ۸۶۲ھ / ۱۴۵۷ء	
۱۲	سلطان نظام شاہ بن ہمایوں	سنہ ۸۶۵ھ / ۱۴۶۱ء	
۱۳	سلطان شمس الدین ابو المظفر محمد شاہ بن ہمایون	سنہ ۸۶۷ھ / ۱۴۶۳ء	اس کے ابتدائی زمانے میں سلطنت بہمنی نے انتہائی وسعت پائی اور آخر میں جب اس نے اپنے وزیر و مربی خواجہ محمود گاواں کو شبہ پر قتل کرا دیا، تو زوال کے آثار پیدا ہونے لگے۔
۱۴	سلطان محمود شاہ بن محمد شاہ	سنہ ۸۸۷ھ / ۱۴۸۲ء تا ۹۲۴ھ / ۱۵۱۸ء	اس کے عہد میں برار، دولت آباد، بیجاپور اور گولکنڈہ کے صوبے آزاد و خود مختار ہو گئے اور امیر برید بن قاسم برید نے بادشاہ کو اس قدر بے حقیقت کر دیا کہ شہر بیدر سے تھوڑی دور باہر بھی کوئی اس کا حکم نہ مانتا تھا، اور بعد کے چاروں بادشاہ محض برائے نام بادشاہ تھے اور اضلاع بیدر و گلبرگہ کی حکومت بھی علانیہ امیر برید کے ہاتھ میں آ گئی تھی حتیٰ کہ آخری بادشاہ چھپ کر بیدر سے نکل گیا۔ اور ایک سال بعد احمد نگر میں وفات پائی۔
۱۵	احمد شاہ بن محمود شاہ	سنہ ۹۲۴ھ تا ۹۳۳ھ / ۱۵۲۶ء	
۱۶	علاء الدین بن احمد شاہ		
۱۷	ولی اللہ بن سلطان احمد شاہ		
۱۸	کلیم اللہ بن احمد شاہ		

۲- وجیانگر کے راجہ

نمبر	نام	سنہ جلوس	کیفیت
	پہلا خاندان		
۱	راجہ ہری ہر بن بکا رائے۔	سنہ ۷۸۱ھ / ۱۳۷۹ء	یہ اُس ہری ہر (اول) کا بھتیجا تھا جس کے زمانے میں شہر وجیانگر کی بنیاد پڑی (۷۳۶ھ / ۱۳۳۶ء) لیکن پہلا خود مختار راجہ اسی ہری ہر (ثانی) کو مانا جاتا ہے واضح رہے کہ اس خاندان کے اکثر سنہ قیاسی ہیں مگر ہم نے آکسفورڈ ہسٹری کی پیروی کی ہے (صفحہ ۳۱۷)
۲	راجہ بکا بن ہری ہر	سنہ ۱۴۰۴ء (؟)	
۳	راجہ دیو رائے (اول)	سنہ ۱۴۰۶ء	
۴	راجہ ویر وجے	سنہ ۱۴۲۲ء (؟)	
۵	راجہ دیو رائے (ثانی)	سنہ ۱۴۲۴ء	
۶	راجہ ملک راجن بن دیو رائے	سنہ ۱۴۴۷ء	
۷	راجہ ویر وپاکش رائے	سنہ ۱۴۶۵ء	

نمبر	نام	سنہ جلوس	کیفیت
۸	راجہ برودھ دیورائے (؟)		
	دوسرا خاندان		
۹	راجہ نرسنگ	سنہ ۱۴۸۹ء	
۱۰	راجہ نرسنگھ (دتیے) رائے	سنہ ۱۴۹۲ء (؟)	
	تیسرا خاندان		
۱۱	راجہ نرس نائک	سنہ ۱۵۰۵ء	عام بدامنی اور شورش۔
۱۲	راجہ ویر نرسنگھ	سنہ ۱۵۰۶ء (؟)	
۱۳	راجہ کرشن دیورائے	سنہ ۱۵۰۹ء	سلطنت وجیانگر کی انتہائی عروج کا زمانہ۔
۱۴	راجہ اکیوت (؟)	سنہ ۱۵۲۹ء	
۱۵	راجہ صداسیو	سنہ ۱۵۴۲ء	برائے نام راجہ تھا حکومت رام راجہ کے ہاتھ میں آگئی تھی۔
	جنگ تالی کوٹ ..... جمادی الثانی	سنہ ۹۷۲ھ م ۱۵۶۵ء	اس جنگ نے سلطنت وجیانگر کا خاتمہ کر دیا تھا لیکن اس کے نام لیوا ایک مدت تک بعد میں بھی جنوبی ہند کے بعض مقامات پر حکومت کرتے رہے۔

صحت نامہ

تاریخ ہند جلد دوم

(برائے انٹرمیڈیٹ) طبع دوم

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۱	۲	۳	۴
۲	۲۴	کرلے	کرکے	۶۷	۱۲	بلے	حملے
۲۲	۲۰	سے	نے	۶۸	۸	حنگجو	جنگجو
۲۵	۱۷	سلعانہ	سلطانہ	۷۱	عنوان حاشیہ	روپیہ کی قیمت خرید	روپیے کی قوتِ خرید
۲۷	۱۴	سلصنت	سلطنت	۸۰	۱۷	گراگر	گراکر
۲۹	۱۳	رنج میں	رنج سے	۹۰	حاشیہ سطر ۲	ماخود	ماخوذ
۳۷	۶	سردارنِ لشکر	سردارانِ لشکر	۱۱۶	۱۴	سکنولوں	منگولوں
۴۵	۷	رُعب ازولِ	رُعب اُودرولِ	۱۲۳	حاشیہ سطر ۴	کہتے	کہنے
۴۹	۱۰	ان تطاع پر	اِن اطلاع پر	۱۲۵	۱۴	بنا بائی گئی	بنائی گئی